(۱۴)

UNIVERSITY OF SINDH

سندھ یونیورسٹی

۲۰۰۶

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

-----◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊◊-----

Departmental Research Journal "Tahqiq", Vol: 14, 2006

Department of Urdu, University of Sindh, Jamshoro, Pakistan

شعبہ جاتی تحقیقی مجلّہ

شمارہ: ۱۴

شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی

۲۰۰۶ء

مجلسِ مشاورت:

۱۔ پروفیسر فتح محمد ملک

چیئرمین، ''مقتدرہ قومی زبان''، اسلام آباد۔

۲۔ پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری

صدر، ''اُردو ڈکشنری بورڈ''، کراچی۔

۳۔ ڈاکٹر جمیل جالبی

اسکالر اور سابق وائس چانسلر، کراچی یونیورسٹی۔

۴۔ پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی

نگرانِ اعلیٰ (اعزازی) شعبۂ تصنیف و تالیف، وفاقی اُردو یونیورسٹی، کراچی کیمپس۔

۵۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

پروفیسر (ریٹائرڈ) شعبۂ اُردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی۔

۶۔ ڈاکٹر فردوس انور قاضی

پروفیسر اور ڈین فیکلٹی آف لینگویج اینڈ لٹریچر، بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ۔

۷۔ ڈاکٹر نجیب جمال

پروفیسر شعبۂ اُردو اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس، اسلامیہ یونیورسٹی، بھاول پور۔

۸۔ ڈاکٹر ظفر اقبال

پروفیسر اور صدر شعبۂ اُردو، کراچی یونیورسٹی۔

۹۔ ڈاکٹر محمد سلیم اختر

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹوریکل اینڈ کلچرل، اسلام آباد۔

۱۰۔ ڈاکٹر سعدیہ نسیم

پروفیسر شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، جام شورو۔

۱۱۔ ڈاکٹر مختارالدین احمد

پروفیسر ایمریطس، علی گڑھ یونیورسٹی، انڈیا۔

۱۲۔ ڈاکٹر خلیق انجم

اسکالر، سیکریٹری انجمن ترقیِ اُردو، ہند، انڈیا۔

۱۳۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

اسکالر، نئی دہلی، انڈیا۔

۱۴۔ ڈاکٹر معین جیناپڑے

صدر شعبۂ اُردو، ممبئی یونیورسٹی، انڈیا۔

۱۵۔ ڈاکٹر مسعود سراج

پروفیسر شعبۂ اُردو، میسور یونیورسٹی، انڈیا۔

۱۶۔ پروفیسر ڈاکٹر ہیرو جی کتاؤکا

صدر شعبۂ اُردو، فیکلٹی آف انٹرنیشنل ریلیشن، ڈائی توبن کا یونیورسٹی، جاپان۔

۱۷۔ ڈاکٹر خلیل طوق اُر

پروفیسر و چیئرمین، ڈیپارٹمنٹ آف اُردو، استنبول یونیورسٹی، ترکی۔

۱۸۔ ڈاکٹر ظہورالدین

پروفیسر اُردو (ریٹائرڈ) شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، جموں تاوی، جے کے، انڈیا۔

۱۹۔ ڈاکٹر سراج الحق

پروفیسر اور صدر، علامہ اقبال ریسرچ اکیڈمی، ڈھاکہ۔

۲۰۔ ڈاکٹر خالد حسین قادری

اسکالر، اے ایل ۲۔ این ۲۰۰، لندن۔

فہرستِ مشمولات

(شعبہ جاتی مجلّہ ''تحقیق''، جام شورو، شمارہ ۱۴، ۲۰۰۶ء)

مقالات

صفحہ نمبر

گوشۂ جامعات

”تحقیق شمارہ“ ۱۴ کے مقالہ نگار

۱۔	ڈاکٹر مختار الدین احمد	پروفیسر ایمریطس برائے عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
۲۔	علامہ اخلاق حسین دہلوی	محقق
۳۔	ڈاکٹر معین الدین عقیل	پروفیسر اور سابق صدر شعبۂ اُردو، کراچی یونیورسٹی۔
۴۔	ڈاکٹر روبینہ ترین	پروفیسر اور صدر شعبۂ اُردو، بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔
۵۔	ڈاکٹر عطش دُرّانی	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔
۶۔	ڈاکٹر تنظیم الفردوس	اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، کراچی یونیورسٹی، کراچی۔
۷۔	ڈاکٹر محمد یوسف خشک	اسسٹنٹ پروفیسر اور صدر شعبۂ اُردو شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیر پور میرس، سندھ۔
۸۔	عتیق احمد جیلانی	اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، جام شورو۔
۹۔	ڈاکٹر سید جاوید اقبال	پروفیسر اور مدیرِ تحقیق، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، جام شورو۔
۱۰۔	نثار احمد	لیکچرر، گورنمنٹ پاکستان (بوائز) ڈگری کالج، سعید پور، بدین۔

پیش گفتار

معیاری تحقیق کے فروغ میں مجلّات کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ یہ موثر اور مثبت تحقیقی سرگرمیوں کے فروغ میں مددگار و معاون ہوتے ہیں، چنانچہ پاکستانی جامعات میں ادبی تحقیق کا وقار بلند کرنے کے ساتھ ساتھ جامعاتی تحقیقی مجلّات کے بلند معیار پر بھی توجہ مبذول کی جانی چاہیے۔

مجھے بے حد مسرت ہے کہ ہماری یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے ریسرچ جرنل ''تحقیق'' نے ادبی تحقیق اور مجلّات پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہ کریڈٹ بلاشبہ ''تحقیق'' کے بے مثال مدیر، باکمال محقق اور نہایت نفیس و شفیق پروفیسر، ڈاکٹر نجم الاسلام کو جاتا ہے، جنھوں نے اپنی اعلیٰ ترین علمی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ انھوں نے مذکورہ مجلّے میں فنِ تحقیق، تحقیقی طریقِ کار اور رسمیاتِ تحقیق کے معیار پر غیر معمولی توجہ دی، یہی وجہ ہے کہ پہلے شمارے ہی نے نام ور اسکالرز کی توجہ حاصل کر لی پھر تسلسل کے ساتھ ''تحقیق'' کے شمارے شائع کیے گئے۔ جس میں ''گوشۂ تحقیقِ منسوبات'' پر مشتمل شمارہ تو غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

ایک طویل عرصے کے بعد رسالہ ''تحقیق'' کا دوبارہ اجراء ہو رہا ہے، یہ خوش آئند بات ہے۔ میں نئے مدیرِ ''تحقیق'' کے لیے دعا گو ہوں۔

اداریہ

''تحقیق'' کا اجراء محترم وائس چانسلر، مظہر الحق صدیقی صاحب (ستارۂ امتیاز) کی خواہش پر ہوا تھا۔ تعطّل کے بعد ''تحقیق'' کا اجرائے ثانی بھی آپ کے ایماء پر ہو رہا ہے۔ چنانچہ ''تحقیق'' کی محفل میں ایک بار پھر محترم وائس چانسلر کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔

''تحقیق'' کا پہلا شمارہ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا جب کہ آخری ۱۹۹۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔ درمیانی عرصے میں گیارہ مزید شمارے شائع ہوئے جن کی اعلیٰ علمی و ادبی حلقوں میں بے حد پذیرائی ہوئی۔ چودھویں شمارے پر کام جاری تھا کہ مدیرِ فاضل ڈاکٹر نجم الاسلام ۱۳، فروری ۲۰۰۱ء کو اس دیارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ اس کے بعد رسالہ ''تحقیق'' کی اشاعت معطّل ہوگئی۔

ڈاکٹر نجم الاسلام علمی دنیا کی ایک باکمال شخصیت تھے۔ آپ علوم و فنون کا ایسا سمندر تھے جس سے ہر مکتبۂ فکر کے افراد مستفید ہوتے تھے۔ انھوں نے وسعتِ قلب کے ساتھ زبان و ادب اور سندھ یونیورسٹی کی خدمت کی۔ مجلّہ ''تحقیق''، آپ کی یادگار ہے، جسے اُردو کی علمی و ادبی تاریخ میں آپ ہی کے نام سے یاد رکھا جائے گا۔

''تحقیق'' کا شمارہ ۱۴ ایک طویل وقفے کے بعد پیش کیا جا رہا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ موضوعات، مواد اور معیار کے اعتبار سے اِس کا رخ وہی رہے جو مجلّہ ''تحقیق'' کی روایت رہی ہے، اس لیے صاحبانِ علم و فضل سے اعلیٰ معیار کے اوریجنل اور غیر مطبوعہ مقالات کی درخواست کی جاتی ہے۔

مدیر

مقالات

ڈاکٹر مختار الدین احمد

منتخب القوافی از عشقی عظیم آبادی

(ایک تعارف)

شیخ محمد وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی کے تفصیلی حالات ان کے شاگرد حسین قلی خاں نے تذکرہ ''نشترِ عشق'' (۱۲۲۴ھ۔۱۲۳۳ھ) میں درج کیے ہیں۔ نسخۂ کتب خانۂ خدا بخش (شمارہ ۲۴۲) سے یہاں اس کا اختصار پیش کیا جاتا ہے:

> شیخ محمد وجیہ الدین عظیم آبادی سلمہٗ اللہ تعالیٰ خلف الصدق شیخ غلام حسین متخلص بہ ''مجرم'' است۔ کلامش در شیرینی و روانی سبقت از آب کوثر و زمزم بردہ و در شفافی و صفائی رونمائی از آئینہ گرفتہ۔ تکلم بطرز خاص می کند و تلاش خوب و مرغوب می نماید۔ اگر چہ در عربیّت زیادہ از صرف و نحو تحصیل نہ کردہ، امّا فارسیت خوب پیدا نمودہ، مصطلحات و زبان دانی آں حاصل ساختہ۔ غزل صاف و عاشقانہ می گوید و انشاء رنگین و پسندیدہ می نویسد۔ آنجناب با راقم بسیار محبت می نمودند اکثر برائے دیدن بہ کاشانہ ام قدم رنجہ می فرمودند، و بندہ را نیز ایشاں موانست و ائتلاف

بوده۔ در بدو حال باستادی خود گزیدم و تا شش ماه چند کتب فارسی تحصیل نمودم و استفادۂ صحبت برداشتم ... اللہ تعالیٰ ایشاں را بہر حال و آوان بفضل خود خوش و خرم نگاه دارد۔ دیوان آن دردمند کہ حاضر است ردیف وار انتخاب کرده داخل مجموعۂ ہذا نمود۔ (ق ۱۲۳۵ھ)

میر وزیر علی عبرتی[1] عظیم آبادی، تذکرہ ''معراج الخیال'' میں لکھتے ہیں:

''عشقی، اسمِ گرامی آن سرِ حلقۂ جادو زبانانِ ہند شیخ محمد وجیہ الدین است خلف الصدق شیخ غلام حسین متخلص بمجرم۔ بوم زاد حمیده بنیادش شہر مینو سواد عظیم آباد و کلام شکر بارش در شیرینی ہمشیرۂ آبِ کوثر و اشعارش در شفافی و صفائی روکش صد آئینۂ سکندر۔ تلاش خیلے و مرغوب نمود، و تکلم بطرز:

نصیب از دمِ تیغ تو شد شہادتِ ما
زہے شہادت ما و زہے سعادتِ ما

چوں آئینہ حیرانم روئے کہ بیاد آمد
بسیار پریشانم موئے کہ بیاد آمد

(تذکرہ عشقی نسخۂ قاضی عبدالودود)

شیخ محمد وجیہ الدین، ''عشقی'' شیخ غلام حسین مجرؔم کے بیٹے تھے جو میر عبداللہ سرشاؔر کے شاگرد تھے۔ عشقی نے ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد سے حاصل کی، پھر انھوں نے ''جامعِ فنونِ سخن دانی، واقفِ قانونِ عالمِ معانی، فخر المتاخرین، اشرف المعاصرین، افصح الفصحا، جناب شاہ محمدؐ وفا، شاگرد مرزا عبدالقادر بیدل'' کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا اور سرمایۂ استعداد فراہم کیا۔ عشقی کو فارسی زبان پر قدرت حاصل تھی اور ان کے فارسی اشعار کی شیرینی و روانی اور شفافی و صفائی کی بعض تذکرہ نویسوں نے تعریف کی ہے۔ ان کی فارسیت و زبان دانی کا اعتراف کیا ہے اور ان کی انشا کو رنگین و پسندیدہ بتایا ہے۔

عشقی کے سنینِ ولادت و وفات کہیں نہیں ملتے۔ آقا حسین قلی خاں ''عاشقی'' عظیم آبادی (۱۱۹۴ھ۔۱۲۵۲ھ) کا، جنھوں نے عشقی سے اس عہد کے متداول درسیات کا سبق لیا تھا، سالِ ولادت ۱۱۹۴ھ ہے، اگر استاد کو شاگرد سے بیس سال بھی بڑا مانا جائے تو عشقی کا سالِ ولادت ۱۷۷۵ء کے لگ بھگ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۹ء۔ ۱۸۱۰ء تک ڈھاکا میں ان کے زندہ رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔ ان کی وفات غالباً بہت بعد کو ہوئی۔ ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی کے ایک مضمون سے معلوم ہوا

کہ ''دیوانِ عشقی'' (نسخۂ پشاور) میں فقیر محمد خاں گویا کی رحلت کا قطعۂ تاریخ درج ہے۔ حسام الدولہ نواب فقیر محمد خاں بہادر لکھنوی شاگرد ناسخ لکھنوی (متوفی ۱۲۵۴ھ) کی وفات ۱۲۶۸ھ میں ہوئی ہے۔ اس طرح عشقی کی وفات ۱۲۶۸ھ یا اس کے بعد ہوئی ہوگی۔ عبرتی عظیم آبادی کے تذکرہ ''معراج الخیال'' کا نسخۂ پٹنہ اور کتب خانۂ پنجاب یونیورسٹی، لاہور اور ذخیرۂ مولانا طالب جوہری کے نسخوں کے عکس جو مشفق خواجہ صاحب کی مہربانی سے حاصل ہوئے ہیں میرے پیشِ نظر ہیں، لیکن تینوں نسخوں میں عشقی کے ترجمے ہیں ''دررقعۂ پاک ڈھاکہ در بار سفرِ آخرت بست'' لکھا ہوا ہے اور سالِ وفات کی جگہ بیاض ہے۔ قاضی عبدالودود مرحوم نے اپنے رسالے ''معیار'' کے مارچ ۱۹۳۶ء کے شمارے میں کچھ ادبی استفسارات چھاپے تھے۔ پہلا استفسار یہ تھا: ''وزیر علی عبرتی کا لکھا ہوا ایک تذکرہ کلکتے میں ہے، اور اس میں وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی کا بھی ترجمہ ہے۔ وفات کا یہاں پر ذکر آیا ہے۔ سنہ کی جگہ چھوٹی ہوئی ہے، کیا دوسرے نسخوں میں سالِ وفات درج ہے؟ ناظرین ''معیار'' کو اگر کچھ معلوم ہو تو مجھے مطلع فرمائیں، ممنون ہوں گا۔'' (ص ۹۶) قاضی صاحب کی وفات ۱۹۸۴ء میں ہوئی۔ تقریباً نصف صدی گزرنے پر بھی انھیں کوئی اطلاع نہیں مل سکی۔

اصل یہ ہے کہ عبرتی کو عشقی کا سالِ وفات معلوم نہ ہوگا۔ انھوں نے اپنے تذکرے کے مسوّدے میں جگہ سادہ چھوڑ دی ہوگی کہ اطلاع ملنے پر بعد کو اضافہ کر دیں گے۔ سالِ وفات عشقی انھیں معلوم نہ ہو سکا یا کسی وجہ سے انھیں اس کے اندراج کا موقع نہ مل سکا۔ مسودے اور پھر قلمی نسخوں سے نقلیں تیار ہوتی رہیں اور بیاض کی جگہ بیاض ہی رہی، یہ بھری نہ جا سکی۔

تصانیف:

اسٹوری نے ''پرشین لٹریچر'' میں صرف ان کے تذکرۂ شعرا کا ذکر کیا ہے اور یہی مشہور بھی ہے۔ راقم کو اب تک ان کی حسبِ ذیل تصانیف کا علم ہو سکا ہے:

۱۔ تذکرۂ عشقی:

شعرائے اُردو کا تذکرہ، جس کے دو نسخوں کا اب تک پتا چلا ہے۔ ایک نسخہ ڈاکٹر اشپرنگر کے پاس تھا، اب کتب خانۂ بوڈلیان، آکسفورڈ میں محفوظ ہے۔ دوسرا نسخہ قاضی عبدالودود کی ملکیت ہے، ان کی وفات کے بعد کہاں گیا معلوم نہیں۔ ان کی کتابیں کتب خانۂ خدا بخش بانکی پور اور کتب خانۂ ایوانِ غالب نئی دہلی میں بطور عطیہ محفوظ ہو گئی ہیں لیکن میرے علم کے مطابق وہاں ''تذکرۂ عشقی'' موجود

نہیں۔ یہ تذکرہ قاضی صاحب مرتب کرنا چاہتے تھے۔اس کے کچھ اجزا کی نقل جو قاضی صاحب کے قلم سے ہے میرے پاس محفوظ ہے۔ نسخۂ آکسفورڈ سے ۲۲ شعراء کے تراجم غائب ہیں اور دو کے ترجمے ناتمام ہیں، یہ قاضی صاحب کے نسخے میں موجود ہیں۔ان تراجم کی نقل میں نے ان سے منگوائی تھی، کچھ اور شعراء کی بھی۔انھوں نے کچھ بھیج دیے تھے کچھ بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ میرے یورپ جانے سے پہلے کی بات ہے۔قاضی صاحب، تذکرۂ عشقی کبھی شاہ مقبول احمد (کلکتہ) اور کبھی راقم کے تعاون سے شائع کرنا چاہتے تھے،انھوں نے کچھ اجزاء کی کتابت (غالباً منشی منیر الدین، سبزی باغ، پٹنہ) سے کرا بھی لی تھی پھر ان کی رائے بدل گئی اور وہ دوسرے امور کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کتابت شدہ کچھ اجزاء میں نے دیکھے تھے۔چھوٹی تقطیع پر بہت گنجان کتابت انھوں نے کرائی تھی، میں نے کہا حواشی واختلافِ نسخ کے لیے ہر صفحے کے نیچے کاتب نے جگہ نہیں چھوڑی ہے۔فرمایا، وہ تذکرے کی تکمیل کے بعد آخر میں درج کیے جائیں گے۔ بہت دنوں کے بعد کلیم الدین احمد (صدر شعبۂ انگریزی، پٹنہ یونیورسٹی) نے ''تذکرۂ عشقی'' اور ''تذکرۂ شورش''، ''دو تذکرے'' کے نام سے ''دائرہ ادب'' پٹنہ سے دو جلدوں میں ۱۹۵۹ء۔ ۱۹۶۳ء میں شائع کر دیے۔ایک اچھے علمی وتنقیدی اڈیشن کی اب بھی ضرورت ہے۔

اس تذکرے کے زمانۂ تصنیف کے متعلق قاضی صاحب لکھتے ہیں: ''فہرستِ اشپرنگر میں تذکرے کا زمانۂ تالیف ۱۲۱۵ھ مرقوم ہے مگر یہ اس سے چند سال قبل شروع ہوا اور ۳۰ھ کے لگ بھگ تمام ہوا۔اس میں طپش کی وفات کا ذکر ہے جو (غالباً) ۱۲۳۰ھ میں رہے ہیں۔اس میں نوا بدایونی (متوفی ۴۰ھ یا ۴۱ھ) کا مرنا بھی لکھا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ ایک زمانے تک (نوا کے ہند سے باہر چلے جانے کی وجہ سے) ان کے حالات سے بے خبری کی بناء پر عشقی نے فرض کرلیا تھا کہ وہ بقید حیات نہیں'' (نقوش اکتوبر ۱۹۵۸ء)۔ میرا خیال ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۱۵ھ سے دس بیس سال پہلے لکھا جانا شروع ہو گیا تھا جیسا کہ بعض اندرونی شہادتوں سے پتا چلتا ہے۔

۲۔ دیوانِ فارسی:

عشقی کے چار دیوان مرتب تھے۔دو مختصر فارسی دیوان سنجیدہ کلام پر مشتمل ہیں اور دو دیوانِ ہزلیات ہیں۔ ان کی ہزلیہ شاعری کے بارے میں کسی تذکرہ نویس نے کچھ نہیں کہا۔حکیم محمد حبیب الرحمٰن مرحوم کے پاس یہ چاروں دیوان تھے اور یہ چاروں دواوین انھوں نے قاضی عبدالودود مرحوم کو مطالعے کے لیے بھیجے تھے۔ یہ کتب خانۂ جامعۂ ڈھاکا میں محفوظ ہونے چاہییں۔اس لیے کہ حکیم صاحب کی وفات کے بعد ان کی بیش تر کتابیں ان کے اعزہ نے وہاں دے دی تھیں۔ پروفیسر محمد کلیم سہسرامی نے

کتب خانۂ جامعہ ڈھاکا میں صرف دو دیوان دیکھے تھے۔ ایک ۱۱۸ صفحات پر مشتمل تھا جس میں غزلیں، رباعیاں، مخمس اور ترجیع بند ہیں۔ دوسرے دیوان کے صفحات ۱۲۶ ہیں۔ اس میں غزلیں، ۲۴ رباعیاں، ایک مخمس اور کچھ فردیات ہیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ فہرستِ کتب خانۂ جامعہ ڈھاکا مرتبہ پروفیسر حبیب اللہ میں دیوانِ عشقی کا ذکر ہے۔ اس کی جلد اوّل اس وقت تلاش سے نہیں ملی۔ قیامِ ڈھاکا کے دوران دیوان دیکھنا چاہا لیکن نہیں ملا۔

عبرتی نے عشقی کا ایک دیوان، عشقی کے شاگرد خواجہ حیدر جان شائق (م تقریباً ۱۲۸۱ھ) کے پاس بھی دیکھا تھا۔

دیوانِ عشقی کا ایک نسخہ کئی سال پہلے ڈاکٹر سیّد امیر حسن عابدی کو پشاور یونیورسٹی کے مرکزی کتب خانے میں ملا۔ (رقم ۶۵۱) اس میں غزلیات، رباعیات کے ساتھ مخمس اور متعدد قطعاتِ تاریخ ہیں۔ غزلیات کی ابتداء اس شعر سے ہوتی ہے:

من و بردن روم از کوئے تو ستمگارا
اجل گرفتہ ز مقتل کجا کشد پا را

عاشقی عظیم آبادی نے اپنے استاد عشقی کے دو سو سے زیادہ اشعار ردیف وار انتخاب کر کے اپنے تذکرۂ ''نشترِ عشق'' میں درج کیے ہیں۔ دیوان کی اشاعت ابھی ممکن نہ ہو تو یہ انتخابِ اشعار ہی شائع کر دینا چاہیے۔

۳۔ قصیدۂ اُردو:

عشقی تخلص کے ایک شاعر کا اُردو قصیدہ سید حسن عسکری مرحوم کو ملا تھا، جو انھوں نے قاضی عبدالودود کو پیش کر دیا تھا۔ جو مؤخرالذکر کے بغیر ممکن ہے شیخ وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی ہی کا ہو۔ یہ قصیدہ انھوں نے ادارۂ تحقیقاتِ اُردو کی اس نمائش میں رکھا تھا جو پٹنہ میں اواخر نومبر ۱۹۵۹ء میں منعقد ہوئی تھی۔ یہ قصیدہ کسی سیّد عطا حسین کی مدح میں ہے جن کی شخصیت راقم پر اب تک واضح نہیں ہو سکی ہے۔ قصیدہ اس مصرع سے شروع ہوتا ہے:

ہے ان دنوں چمنِ دہر میں وہ فصلِ بہار

اس کا آخری شعر یہ ہے:

زباں کو روک، تو خاموش ہو اب اے عشقی
نہ اس کی مدح کا دل میں خیال کر زنہار

عشقی، فارسی گو شاعر ہے۔ اس کے اب تک صرف پان سات ہی اُردو شعر ملے ہیں، اس لیے اس قصیدے کی اہمیت ظاہر ہے۔

۴: بیاضِ عشقی:

عشقی کی ایک بیاض بھی حکیم حبیب الرحمٰن صاحب کے پاس ڈھاکے میں تھی۔ مجھے وہاں تلاش پر نہیں ملی۔ یہ دریافت ہو جائے تو مستبعد نہیں کہ اس سے بعض اہم اور قیمتی ادبی معلومات حاصل ہوں۔

۵۔ جامع العَروض:

عشقی نے ''منتخب القوافی'' جس کا ذکر ابھی آ رہا ہے، مرتب کرنے سے پہلے نسبتاً ایک ضخیم کتاب علمِ عروض پر لکھی تھی۔ بعد کو خاتمۂ کتاب سے قوافی کی بحث علاحدہ کر کے ایک مختصر سا رسالہ انھوں نے علاحدہ مرتب کیا۔ وہ لکھتے ہیں: ''ایں مختصریست کافی در علم قوافی از خاتمۂ کتاب جامع العروض، کہ قبل ازیں ... درفنِ سخن دانی تالیف نمودہ۔ الحال ... چند اوراق بمصداق خیر الامور اوسطہا، پذیرائے تحریر سازد''۔

''جامع العروض'' کا کسی تذکرہ نویس نے ذکر نہیں کیا اور نہ اس کے کسی نسخے کے وجود کی اب تک اطلاع ملی ہے۔

۶۔ منتخب القوافی:

شیخ وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی مؤلف ''تذکرہ شعرائے اُردو'' کے رسالے ''منتخب القوافی'' کا ذکر میں نے کہیں نہیں دیکھا، لیکن اس کا ایک قلمی نسخہ ایک ادبی نمائش میں جو پچاس سال پہلے پٹنہ میں ہوئی تھی، میری نظر سے گزرا تھا اور اس زمانے میں، میں نے اس سے متعلق ایک یادداشت لکھ لی تھی۔ سطور ذیل اسی یادداشت پر مبنی ہیں۔

منتخب القوافی کے صفحات کی تعداد ۱۳۱ ہے۔ صفحہ اول و آخر میں سطروں کی تعداد علی الترتیب ۶ اور ۱۱ سطریں ہیں۔ رسالے کی ابتداء ان سطور سے ہوتی ہے:

> ''بعد از قافیہ سرائی حمد سخن پرداز معنی آفرین و پس از غزل سرائِ نعت نبوت طراز عقلِ اوّلین می گوید فقیر حقیر ابجد آموز دبستانِ بے استعدادی، عشقی عظیم آبادی کہ ایں مختصریست کافی در علم قوافی از خاتمۂ کتاب ''جامع العروض'' کہ قبل ازیں ... درفنِ سخن دانی تالیف نمودہ، الحال بالتماس بعضے از محبان سخن رس و سخن

رسانِ روشن نفس چند اوراق بمصداق مضمون فیض مشحون خیرالامور اوسطہا پذیرائے تحریری سازد چوں بہ فضلِ ایزدی وعون سرمدی ایں رسالہ بہ اتمام رسید، بہ ''منتخب القوافی'' موسوم گردید۔ قطعہ تاریخ:

حبذا ایں رسالہ (شد) رنگین
کہ ازو طبع شاعراں شد شاد
گفت ہاتف دعائیہ تاریخ
یادگارِ سخن طرازاں باد

امید ہے کہ قافیہ سنجان بزمِ نکتہ پروری بہ چشم الطاف ملاحظہ فرمایند وجگرِ مؤلف بے چارہ کہ...... بیش نیست بہ زخم ناخن انگشت اعتراضِ بے جاوتو جہاتِ چون وچراخراشندو باللہ التوفیق''۔

''منتخب القوافی'' جیسا کہ اقتباسِ بالا سے معلوم ہوتا ہے عشقی کی ''جامع العروض'' کا خاتمہ ہے، مگر عشقی نے اسے ایک مستقل رسالے کی شکل دے دی ہے۔ مصرع تاریخ سے ۱۲۲۱ھ کے اعداد نکلتے ہیں، یہ اس رسالے کی تاریخِ تصنیف ہوئی۔

رسالے کا خاتمہ ان سطور پر ہوتا ہے:

''الممنۃ للہ تعالیٰ وتقدس کہ شاہد تالیف ایں رسالۂ دل کشا ونسخۂ فرحت افزا کہ نمک ریزیٔ فقراتِ سادہ ونمکین، درنمک آمیزیٔ اشعارِ آبدار دل نشین، رشک سبزانِ ہندونگارخانۂ چین است سرازمنظرِ آغاز برآوردو بہ خلوت کدۂ انجام جلوہ افروز گردیدوطبع عاشق سخن معنی پسند نوید مسرت جاوید خاتم بالخیر بگوشِ ہوش سریرآرایانِ کشورِ سخن دانی ومسند سرایانِ قلم رِو نکتہ دانی رسانید:

ایں نسخہ کہ باشد گلِ گل زارِ معانی
آبے برخ آوردہ از و کارِ معانی
اندر چمنش بس کہ گلِ قافیہ بشگفت
بشگفت از و طبع خریدارِ معانی
تمام شد تاریخ......

ماہ ساڑھ روز چہار شنبہ سنہ ۱۲۶۰ فصلی''

عشقیؔ نے سند میں حسبِ ذیل شعراء کے اشعار پیش کیے ہیں: سعدیؔ، حافظؔ، جامیؔ، طاہر وحید، فیضیؔ، محمد حسین آشوبؔ، کلیمؔ، وحشیؔ، اہلی خراسانی، محتشم کاشیؔ، صائبؔ، حزیںؔ، قدسیؔ، ہلالیؔ، منیرؔ لاہوری۔

عشقیؔ نے اپنے اشعار سے بھی سند دی ہے، دیوان اب تک غیر مطبوعہ ہے، اس لیے یہ اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں:

بے قدر کس بہ عشق نہ شد ایں قدر کہ ما
یک بیدلے نہ گشتہ چنیں در بدر کہ ما
لیلیٰ نہ بود آں ہمہ بیگانہ خو کہ تو
مجنوں نہ کرد ایں ہمہ خاکے بسر کہ ما
شیریں نہ داشت ایں ہمہ شیریں لبے کہ تو
فرہاد جاں نہ داد چنیں سہل تر کہ ما
عذرا نہ داشت ایں رخِ سحر آفریں کہ تو
وامق نہ ریخت ایں ہمہ خونِ جگر کہ ما
ایوب کرد در دلِ سنگین او اثر
کس نالہ سر نہ کرد چنیں بے اثر کہ ما
"عشقیؔ" بہ جامِ عشق زخود بے خبر شدیم
یارب کسے مباد چنیں بے خبر کہ ما

کج ادائی شعارِ یارِ من است
نیک بدخو جفا شعارِ من است

چوں بہ چمن آں نگار با رخِ زیبا رسید
لالہ شد از رشک داغ غنچہ گریباں درید

چوں سرخ کرد زمے شوخِ گل عذار عذار
ربود یک بہ یک از جانِ بے قرار قرار

... چوں صنوبر دے رخت شک قمر
غنچہ را از رشکِ لعلت خارِ حسرت در جگر

ما دردِ دلِ خویش نہفتیم نہ گفتیم
تا شب سحر از درد نہ خفتیم نہ گفتیم

تاکے جفاے ہجر کشد درد مند تو
فریاد از مزاجِ تغافل پسند تو

تا چند ز ناز سر گرانی
از من فداے بدگمانی

عشقِ گلِ روے تو مرا مجنوں کرد
بوے گیسوے تو مرا مفتوں کرد
دل بشگفت از سر چمن آہ چہ ساں
شوقِ سرِ کوے تُو مرا محزوں کرد

من در غمِ ہجرِ تو ز جان آہ بجاں
تن در غمِ ہجرِ تو ز جان آہ بجاں
رحمے کہ دلِ غم زدہ آمد اے دوست
اندر غمِ ہجرِ تو ز جان آہ بجاں

یارب دلِ حق بیں (بمنِ) بیدل دہ
کوشش بہ ... منِ بیدل نہ

ڈاکٹر مختارالدین احمد

رسالۂ قافیہ از جوشش عظیم آبادی

(مختصر تعارف)

شیخ محمد روشن جوشش عظیم آبادی، عہدِ علی وردی خاں کے ایک ممتاز سردارِ فوج اور راجا رام نرائن موزوں عظیم آبادی کے رفیق، جسونت رائے ناگر کے بیٹوں میں سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ بھگونت رائے سب سے بڑے تھے، پھر محمد عابد دل عظیم آبادی اور ان کے بعد شیخ محمد روشن جوشش۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ان کے کوئی اور بھائی بھی ہوں لیکن اس کا ذکر کتبِ تاریخ اور دوسرے مصادر میں نہیں ملتا۔ قبولِ اسلام سے پہلے محمد عابد اور محمد روشن کے نام کیا تھے معلوم نہ ہو سکے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ بھگونت رائے، ان دونوں کا حقیقی بھائی نہ ہو علاتی بھائی ہو، شورش عظیم آبادی، نواب علی ابراہیم خلیل جو ذاتی طور پر جوشش اور دل سے واقف تھے۔ حیرت ہے کہ اپنے تذکروں میں ان کی ولدیت اور تبدیلِ مذہب کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ ''تذکرۂ عشقی'' اور ''تذکرۂ قدرت اللہ شوق'' میں بھی اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ''مسرت افزا'' میں ہے:

> ''ہر دو برادر از صلب جسونت رائے ناگر... مشارٌ الیہ از صغر سن رغبت بہ اسلام داشت، چوں بہ حد تمیز رسیدہ بشرف دینِ احمدی مشرف گشتہ۔ فقیر احوال ایشاں مفصل از بھگونت رائے خلف جسونت رائے کہ فی مابین خصوصیت ہا و دوستی ہاست معلوم نمود''۔

قاضی عبدالودود صاحب کے خیال میں تبدیلِ مذہب کا واقعہ ۱۱۷۰ھ اور ۱۱۷۶ھ کے درمیان وقوع آیا ہوگا۔

☆ بھگونت رائے سپاہی پیشہ تھا غالباً اس کی جاگیر بھی تھی۔ اپنے باپ کی وفات (یہ شوال ۱۱۷۰ھ تک زندہ تھا) کے بعد اس کا جانشیں ہوا۔ ''مظفر نامہ'' اور رام نرائن کے خطوط میں اس کا کئی جگہ ذکر آیا ہے۔ میر قاسم نے رام نرائن کے ساتھ بھگونت رائے کو بھی قید کیا تھا۔

☆ محمد عابد دل، محمد روشن جوشش سے عمر میں بڑے تھے۔ کتنے بڑے یہ نہیں کہا جا سکتا۔ ۱۱۷۶ھ سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے کہ یہی سالِ تالیف رسالہ ''عروض الہندی'' ہے جس میں ان کا

نام محمد عابد درج ہے۔ یہ شاعر، طبیب اور ہیئت داں تھے۔ اوائل عمر میں سپاہی پیشہ بھی ہوں تو عجب نہیں۔ دیوان، ۱۱۹۴ھ یا اس سے پہلے مرتب ہو چکا تھا۔ شورش نے ان کے دیوان کا ذکر کیا ہے۔ (دیوانش قریب دو ہزار شعر خواہد بود)۔ مردان علی خاں مبتلا دیوان دیکھنے کے مدعی ہیں، وہ تعدادِ اشعار ایک ہزار بتاتے ہیں۔ علی ابراہیم خاں کو ''گلزارِ ابراہیم'' میں اندراج کے لیے دیوان کا انتخاب خود محمد عابد دلؔ نے اُن کے پاس بھیجا تھا۔ (خلاصہ دیوانِ خود فرستادند) ایک زمانے سے مفقود تھا۔ میں نے آکسفورڈ کے دورانِ قیام محمد عابد دلؔ کے ۴۰۰ سے کچھ زائد شعر بوڈلین لائبریری میں محفوظ تذکروں سے جمع کیے تھے۔ واپسی پر قاضی صاحب سے ذکر آیا تو انھوں نے اطلاع دی کہ انھوں نے بہت پہلے یہ اشعار جمع کر رکھے ہیں اور وہ چھپوانے والے ہیں۔ یہ سن کر میں نے انھیں مرتب کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بعد کو میں نے مختلف مصادر سے قاضی صاحب کے جمع کردہ اشعار کا مسودہ دیکھا اور کتابت کیے ہوئے اجزا بھی جن کی کتابت پٹنہ کے مشہور کاتب منشی منیر الدین (برقی پریس، سبزی باغ پٹنہ) نے کی تھی۔ پھر اس کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ اس عرصے میں قاضی صاحب کو سید حسن عسکری سے اطلاع مل گئی کہ نواب علی ابراہیم خاں خلیل عظیم آبادی کے خانوادے میں کسی کے پاس ''دیوانِ دل'' کا نسخہ محفوظ ہے۔ انھوں نے یہ سنتے ہی کام روک دیا کہ اصل دیوان کے مطالعے کے بغیر یہ انتخاب شائع نہیں ہونا چاہیے۔ کئی برس گزر گئے نسخہ حاصل نہ ہوا۔ پھر معلوم ہوا نسخہ اپنے مالک کے ساتھ کراچی پہنچ گیا۔ وہاں سید وصی احمد بلگرامی نے علی ابراہیم خاں خلیل کے اخلاف سے حاصل کیا، اس کی ایک نقل تیار کی اور اس پر تمہید لکھی۔ بعد کا کام سید ظفیر الحسن صاحب نے کیا۔ اس پر مفصل مقدمہ لکھا۔ اسے مرتب کیا اور مکتبۂ مہر نیم روز، کراچی سے ۱۹۷۴ء میں شائع کیا۔

محمد عابد دلؔ کی دوسری کتاب ''عروض الہندی'' ہے جو ۱۱۷۶ھ میں تالیف ہوئی۔ عشقیؔ عظیم آبادی نے دلؔ کے ترجمے میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ تعجب نہیں ان کی نظر سے بھی گزری ہو۔ عشقیؔ نے ان کی عروض دانی کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''مردے کہنہ مشق و صاحبِ استعداد و در اکثر علوم مثل فن طبابت و صرف و نحو و رسالہائے فارسی و ہیئت و بعض قواعد ضرور یہ عروض کہ بہ ''عروض الہندی'' موسوم است بقواعدِ اشعارِ ریختہ بطریق شعرائے عجم بہ سلکِ تالیف درآورد''۔

اس کا ایک نسخہ کتب خانۂ خدا بخش میں محفوظ ہے۔ یہ فارسی زبان میں عروض کا مختصر رسالہ ہے جسے ڈاکٹر سید علی حیدر نیرؔ نے ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ سے شائع کر دیا ہے۔

محمد عابد دل کے سنینِ ولادت و وفات نہیں ملتے۔ تذکرۂ عشقی میں ہے: ''آخر ہمانجا (شہرِ عظیم آباد) ودیعت حیات سپرد۔'' تذکرۂ عشقی کی ترتیب کا زمانہ ۱۲۰۵ھ سے ۱۲۳۶ھ تک پھیلا ہوا ہے۔ کچھ نہیں معلوم کہ دلؔ کا حال کب لکھا گیا۔ قرائن کہتے ہیں کہ ۱۲۱۶ھ کے بعد ان کی وفات ہوئی۔ دیوانِ جوشش میں میر وارث علی نالاںؔ متوفی ۱۱۹۵ھ اور محمد علی مشتاق (متوفی ۱۲۱۶ھ) کے قطعاتِ تاریخِ وفات درج ہیں۔ ترتیبِ دیوان کا سال معلوم نہیں لیکن بہر حال ۱۲۱۶ھ تک اگر بھائی کی وفات ہوگئی ہوتی تو خیال ہے کہ جوششؔ، ان کی وفات کا قطعۂ تاریخ ضرور درج کرتے۔ یہ بات قطعی نہیں لیکن قیاس کیا جاسکتا ہے کہ محمد عابد دل کی وفات ۱۲۱۶ھ کے بعد ہوئی ہوگی۔

☆ محمد روشن جوششؔ جیسا کہ اوپر گزرا بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ عظیم آباد کے مایۂ ناز شاعروں میں تھے۔ ہم عصر تذکرہ نگار، ان کی استادی کے قائل ہیں، اور شیفتہ سا مشکل پسند نقاد ان کی نغز گوئی کا معترف ہے۔ سالِ ولادت کہیں نہیں ملتا وہ ۱۱۵۰ھ کے لگ بھگ عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت بھی غالباً یہیں پائی۔ اس زمانے میں فارسی زبان اور اس کے ادب سے واقفیت اس قدر عام تھی کہ اس کے بغیر کوئی شخص شائستگی کا مدعی نہیں ہوسکتا تھا، یہ کیوں کر مستثنیٰ ہو سکتے ہیں۔ خاندانی روایات کے اقتضاء سے فنونِ سپہ گری بھی سیکھے ہوں گے، تیر اندازی خاص طور پر۔ ان کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ تبدیلیِ مذہب ہے۔ شعر گوئی کی ابتدا ۱۱۷۰ھ یا کچھ اس سے قبل و بعد ہوئی، اس زمانے میں عظیم آباد میں شاعری کا گھر گھر چرچا تھا اور محمد باقر حزیںؔ اور دردمند سے خوش گو شاعر اہلِ عظیم آباد کو دہلی کی طرزِ گفتار سے آشنا کر چکے تھے۔ وفات کا ذکر کسی قدیم تذکرے میں نہیں۔ اس صورت میں قطعی طور پر جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ۱۲۱۶ھ تک زندہ تھے۔ مشتاق کی تاریخِ وفات کا قطعۂ تاریخ جو دیوان میں موجود ہے اس کی شہادت دیتا ہے۔

(مقدمۂ دیوان از قاضی عبدالودود)

''دیوانِ جوشش'' کے مرتب قاضی عبدالودود صاحب نے آج سے ساٹھ سال پہلے جو کچھ لکھا تھا اس کا خلاصہ اوپر پیش کیا گیا۔ دیوانِ جوششؔ، طبع دوم، مرتبہ پروفیسر کلیم الدین احمد میں جو طبع اول کے کوئی ۳۵ سال بعد ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا ہے۔ شاعر کے حالاتِ زندگی میں کوئی اضافہ نہیں ملتا۔ اس لیے کہ اس عرصے میں نہ تو نئی معلومات سامنے آئی ہیں اور نہ دیوان کے اس نسخے کے اندراجات سے جو بعد کو دریافت ہوا ہے کوئی ایسی بات معلوم ہو سکی ہے جو پہلے سے معلوم نہ تھی، اس لیے اس میں بھی جوششؔ کے سنینِ ولادت و وفات ۱۱۵۰ھ کے لگ بھگ قرار دیے گئے ہیں۔

راقم کا خیال ہے کہ جوشش کی ولادت ۱۱۵۰ھ سے کچھ پہلے ہوئی ہوگی۔ اس لیے کہ ۱۱۷۶ھ یا اس سے بھی قبل کے اشعار میں ان کے یہاں خاصی پختگی ملتی ہے۔ اس وقت ان کی عمر پچیس چھبیس سال پڑتی ہے۔ اس عمر میں کلام میں خاصی پختگی کا ہونا مستبعد نہیں لیکن زیادہ قرینِ قیاس بھی نہیں۔ ان کی شعر گوئی کی ابتدا اگر ۱۱۷۰ھ کے لگ بھگ فرض کی جائے تو چھے سال کی مشق میں کلام کا خاصا پختہ ہو جانا مشتبہ ہوتا ہے۔ جوشش کی پیدائش ۱۱۵۰ھ سے کچھ پہلے اور ان کی شاعری کی ابتدا ۱۱۶۵ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی۔

سالِ ولادت کی طرح جوشش کا سالِ وفات بھی محقق نہیں۔ دیوان کے مرتبِ اوّل قاضی عبدالودود صاحب لکھتے ہیں: ''قطعی طور پر جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کہ [جوشش] ۱۲۱۶ھ تک زندہ تھے۔ مشتاق کی وفات کا قطعۂ تاریخ جو دیوان میں موجود ہے اس کی شہادت دیتا ہے'' مرتب دوم کلیم الدین احمد، قاضی صاحب کا قول نقل کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں: ''گویا قطعی طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ جوشش ۱۲۱۶ھ تک زندہ تھے۔''

اتفاق سے راقم کو ایک ایسی شہادت ملی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جوشش کی وفات ۱۲۱۶ھ کے کوئی بیس سال بعد ۱۲۳۶ھ میں ہوئی۔ کلیاتِ ناسخ مخزونہ جامعۂ لکھنؤ جو ناسخ کی زندگی میں مرتب ہوا ہے اور جس میں ۱۲۴۳ھ سے ۱۲۵۱ھ تک کے کچھ اہم تاریخی قطعات درج ملتے ہیں جن میں بعض قطعات ہنوز غیر مطبوعہ ہیں، (تفصیلات کے لیے دیکھیے مقالاتِ حیدری، ص ۲۱۰، از ڈاکٹر اکبر حیدری) ان میں جوشش کی وفات کا قطعہ تاریخ ملتا ہے:

شیخ ذی دانش محمد روشن آہ
عازمِ ملکِ عدم شد زیں سرائے

گفت ناسخ مصرعِ سالِ وفات
شہرِ شوال و شبِ آدینہ ہائے

۱۲۳۶ھ

اس قطعے سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جوشش کی وفات ۱۲۳۶ھ میں شوال کے مہینے میں شبِ جمعہ کو ہوئی۔ کوئی مستند تقویم مل جائے تو تاریخ معلوم ہو جائے گی۔

دیوانِ ناسخ میں اس قطعے پر عنوان یہ درج ہے: ''تاریخِ وفات شیخ محمد روشن جوشش۔''

جوشش کی تصانیف میں اُردو دیوان اور رسالۂ قافیہ ملتا ہے۔ اگر انھوں نے نظم و نثر میں کچھ اور لکھا تو اب اس کا سراغ نہیں ملتا۔

دیوانِ اُردو:

دیوان کا ایک نسخہ ۱۲۳۸ھ فصلی/ ۱۲۴۷ھ کا لکھا ہوا صوبۂ بہار کے مشہور عالم و مصنف و شاعر شوق نیموی مرحوم کے کتب خانے سے قاضی عبدالودود صاحب کو ان کے صاحب زادے عبدالرشید نیموی سے غالباً ۱۹۳۵ء میں ملا تھا۔ یہ نسخہ منحصر بفرد تھا۔ قاضی صاحب نے اسے اپنے تفصیلی مقدّمے اور قیمتی حواشی کے ساتھ انجمنِ ترقی اُردو ہند، دہلی سے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء میں اس کا دوسرا نسخہ پروفیسر سید حسن عسکری اور پروفیسر محمد حسین کو نظامت پیلس مرشد آباد میں ملا۔ اب یہ نسخہ مفقود الخبر ہے۔ اس کے مندرجات کا بالکل علم نہ ہو سکا۔ کچھ دنوں کے بعد پروفیسر سید حسن عسکری اور ڈاکٹر قیام الدین احمد کو بتیا راج بہار کے کتب خانے میں کچھ قدیم شعرائے اُردو، ضاحکؔ دہلوی، راسخؔ عظیم آبادی، فدویؔ عظیم آبادی، شاہ رکن الدین عشقؔ اور جوششؔ عظیم آبادی کے دواوین ملے۔ اس میں بہت سا کلام ایسا ملا جو دیوانِ طبع اوّل میں موجود نہیں۔ کلیم الدین احمد صاحب نے مرتب کر کے ۱۹۷۶ء میں بہار اُردو اکیڈمی کی طرف سے شائع کر دیا ہے۔

رسالۂ قافیہ:

جوشش کے رسالۂ قافیہ کے صرف ایک ہی نسخے کا اب تک پتا چلا ہے اور وہ کتب خانۂ خدا بخش میں محفوظ ہے۔ یہ راقم کی نظر سے گزرا ہے اور ایک زمانے میں اسے شائع کرنے کا بھی خیال تھا اور اس کی نقل بھی تیار کر لی گئی تھی۔ لیکن اس وقت قاضی صاحب کی لکھی ہوئی وہ یادداشت پیشِ نظر ہے جو انھوں نے مقدّمۂ دیوان کے لیے تیار کی تھی کتب خانے سے اس نسخے کی عکسی نقول کے حصول کی کوششیں اب تک کامیاب نہیں ہو سکی ہیں۔

اس نسخے کے صفحات کی تعداد ۲۲ ہے اور تعدادِ سطور مختلف، کسی صفحے میں چودہ، کسی میں پندرہ اور بعض صفحوں میں سولہ سطریں ہیں۔ نسخے پر کاتب نے اپنا نام نہیں لکھا لیکن اس پر تاریخِ کتابت چہار رمضان المبارک ۱۲۱۳ھ فصلی درج ہے۔ یہ سمجھ میں نہ آیا کہ ماہ رمضان المبارک لکھا تو ہجری سنہ کے بجائے فصلی سال کیوں درج کیا۔

رسالے کی ابتدا ان سطور سے ہوتی ہے:

> ''بعد حمد الٰہی و نعت رسالت پناہی کہ تقریر و تحریر آں نامتناہی ست۔ ایں مختصرے ست مشتمل بر علم قوافی کہ بہ پاس خاطر میر محمد امین صاحب سلمہٗ اللہ تعالیٰ، فقیر حقیر محمد روشن متخلص بہ جوشش از رسائل ہا تالیف نمودہ، قواعدات فارسی را بہ چند فصل بیاں می نماید''۔

رسالے میں کوئی خاص بات نہیں اور نہ اس کی تالیف جوشش کے لیے باعثِ فخر ہوسکتی ہے۔ مثالیں سب کی سب فارسی سے دی گئی ہیں۔ جوشش نے اپنا یا کسی اُردو شاعر کا کوئی شعر درج نہیں کیا۔ بیان کہیں کہیں الجھا ہوا بھی ہے۔ ممکن ہے کاتب کی غلطی اس کی ذمّے دار ہو۔

دو اقتباسات بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

☆ ''قدما برآنند کہ قافیہ معروف و مجہول را در یک شعر جمع نہ کنند، و متاخرین جائز داشتہ اند، چناں چہ در مطلع شیخ محمد حزیں کہ از شاعرانِ متاخرین ست آوردہ:

زاں رو کہ زد بہ بلبلِ پُر شور پشتِ دست

تا حشر بنگرد گلِ مغرورِ پشتِ دست''

☆ ''باید دانست کہ آوردن ردیف در شعر واجب نیست بہ خلاف قافیہ کہ جز ذات شعر ست، و ردیف واجب التکرار ست تغیرِ او جائز نیست، مگر وقتے اشارتے بہ تغیر او نمایند... و ردیف بے کار آوردن عیب ست۔''

رسالے کے آخر میں جوشش نے شعر کی بارہ قسمیں بتائی ہیں۔ قصیدے کی تعریف کی ہے کہ مطلع ہو اور اشعار کی تعداد سولہ سے کم نہ ہو۔ غزل تین شعر سے کم اور پندرہ شعر سے زیادہ نہیں ہوتی۔ جوشش نے رباعیوں کے بارے میں لکھا ہے کہ مقررہ چوبیس اوزان کے علاوہ بھی اساتذہ نے دوسرے اوزان میں رباعیاں کہی ہیں۔

جوشش نے رسالے کی تمہید میں لکھا تو ہے ''از رسائل ہا تالیف نمودہ'' لیکن اس میں ''معیار الاشعار'' کے سوا کسی دوسری کتاب کا حوالہ نہیں ملتا۔

(۲۵ر جولائی ۲۰۰۰ء)

علامہ اخلاق حسین دہلوی

تحقیقی مضامین کا اسلوب

(تحقیق اور منہاجِ تحقیق سے متعلق چند تصریحات)

تحقیق کے معنی ہیں کھوج لگانا اور حقیقتِ حال کو دریافت کرنا۔ تحقیق کی بنیاد ہمیشہ اعلیٰ اصولوں پر ہوتی ہے، جو فطرت کے مطابق ہوتے ہیں۔

ا۔ تحقیق میں، معلومات فراہم کرنا، سلیقے سے اس کو مرتّب کرنا، کامل احتیاط اور انضباط سے کام لینا اور موضوع سے متعلق اصول کو برتنا پڑتا ہے۔ اور چوں کہ اقتباسات، موضوع کو صحت سے زیادہ قریب رکھتے ہیں لہٰذا اقتباسات کا شمول بھی از بس کہ ضروری ہوتا ہے۔ گویا کہ معقول دلائل، حوالہ جات اور اقتباسات اور برمحل تبصرہ تحقیق کے لوازم ہیں تاکہ بات سے بات نکلتی چلی آئے اور لڑی سے لڑی جڑتی چلی جائے اور مفہوم آئینے کی طرح جلا پاتا رہے۔ یہ ہے تحقیقی مضامین کی تدوین کا طریقۂ کار۔

۲۔ فراہمیِ معلومات اور تلاش و تجسس میں پوری کوشش صرف کرنی ہوتی ہے اور کمالِ عرق ریزی اور جاں فشانی سے کام لینا پڑتا ہے، سرسری قلم برداشتہ لکھ دینے سے تحقیق کا حق ادا نہیں ہوتا اور نظرِ تحقیق سے اسے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی تحریر سے نہ ظنِ غالب کو فائدہ پہنچتا ہے اور نہ اس میں کوئی پایہ داری ہوتی ہے اور نہ وہ کسی الجھے ہوئے مسئلے کو سلجھا سکتی ہے۔ تحریر میں خونِ جگر کی جتنی چاشنی ہوگی اتنی ہی وہ مؤثر ہوگی۔

۳۔ تاریخی پس منظر سے آ گاہی، گرد و پیش کے حالات سے واقفیت اور عصری رجحانات سے باخبر ہونا بھی تحقیق نگار کے لیے لابدی ہے کیوں کہ صحیح تاریخی شعور کے بغیر تحقیق نگار کا ہر قدم کعبے کو نہیں ترکستان کو اٹھتا ہے، اور وہ گم راہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ تحقیق میں روایت و درایت، حال و ماحول، ماضی و مستقبل سب ہی سے کام لینا ہے اور عملِ تنقیح سے ہر بات کو صاف و منقح کر کے پیش کرنا پڑتا ہے۔ تحقیق میں من مانی نہیں چلتی بلکہ دائرۂ عمل میں رہتے ہوئے پورے حزم و انضباط کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ تحقیق ایک مستقل فن ہے۔ خیالات کی وادیوں میں بھٹکتے رہنے والے صوفی و مرتاض بزرگوں میں وہ ثبات و قرار کہاں جو اس سیلِ تند رو کی مقاومت کر سکیں۔ لامحالہ کہیں الحاق و تحریف سے استعانت حاصل کرنی پڑتی ہے اور کہیں کذب و افترا سے کام نکالنا پڑتا ہے۔ درحقیقت ایسے بزرگ اس میدان کے مرد نہیں ہوتے، اگر جذبات سے مغلوب ہو کر کبھی میدان میں اُتر بھی پڑتے ہیں تو انجام کار تیورا کر اُلٹے پھر جاتے ہیں۔ غرض کہ تحقیق ایک خارزار ہے۔ اس میں سے سلامتی کے ساتھ گزر جانا ہر کس و ناکس کا کام نہیں، مگر جسے خدا توفیق دے۔ یخلق مایشاء و یختار۔

۴۔ تحقیق، جذبۂ زندگی سے وجود میں آتی ہے اور وہ بذاتِ خود زندگی تصور کی جاتی ہے۔ تحقیق کے باب میں نہ صرف کتابوں کا علم اور کتابوں کا مطالعہ کافی ہوتا ہے بلکہ کائنات کا علم اور زندگی کا مطالعہ اور نفسیات سے واقفیت بھی درکار ہوتی ہے۔ جو اس سے بے بہرہ ہے وہ کتنا ہی کثیر المطالعہ کیوں نہ ہو کتنا ہی عابد و زاہد کیوں نہ ہو، اس راہ کا راہ رو نہیں ہوتا اور اس کی تحقیق نما تحریر، افسانہ گوئی، بُت گری اور مدحت سرائی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

۵۔ ذہن کا رسا ہونا اور طبیعت کا نکتہ رس ہونا، تحقیق نگار کا خصوصی وصف ہے۔ اور اگرچہ یہ خوبی فطری ہوتی ہے لیکن مشق و ممارست اور مطالعے و تجربے سے اور عملِ پیہم کی برکت سے پروان چڑھتی اور پختہ ہوتی اور جلا پاتی ہے اور جب تک یہ وصف حدِ بلوغ کو نہیں پہنچتا، تحقیق کا حق ادا نہیں ہوتا۔ ذہنی کاہلی اس راہ میں بدترین گناہ ہے۔ جو تحقیق، ذہنی کاہلی کی پیداوار ہوتی ہے صدا بصحرا ہو کر رہ جاتی ہے اور ابدیت اور مقبولیت سے محروم رہتی ہے۔

۶۔ تحقیق کا اور تنقید کا اور تنقیح کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر وہ شے جو دائرۂ تحقیق میں جگہ پانے کی مستحق تصور کی جاتی ہے، اس کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنا پڑتا ہے اور اس کے عیب و صواب اور حسن و قبح سے آگہی حاصل کرنی ہوتی ہے اور عملِ تنقیح کے ذریعے اسے صاف ستھرا کرنا ہوتا ہے تاکہ کسی قسم کا تکدر باقی نہ رہے۔

تحقیق میں روایت و درایت، حال و ماحول، توازن و توافق، تحلیل و تجزیہ، سب ہی سے کام لینا پڑتا ہے لیکن کہیں کھل کر سامنے آنا ہوتا ہے اور کہیں رمز و کنایہ سے کام نکالنا پڑتا ہے، اور یہ موقع شناسی پر مبنی ہے۔ کلام کی روح کو سمجھنے اور حقائق سے آگاہ ہونے کی کوشش کرنی لازم و لابد ہے، جب کہیں حقیقتِ حال کا انکشاف ہوتا ہے اور صحیح نتیجے پر پہنچا جاتا ہے۔

تحقیق نگار کو تصویر کے دونوں رُخ دیکھنے اور دکھانے ہوتے ہیں۔ حسن و قبح کو جانچنا، پست و بلند پر نظر رکھنا، ابہام اور الجھاؤ کو سلجھانا اور کذب و افترا کا پتا چلانا، خصوصاً جب کذب و افترا، سچ کا چولا پہن کر نمودار ہوا ہو تو مزید کاوش اور دل سوزی سے کام لینا ہوتا ہے، جب کہیں جا کر تحقیق نگار اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ رطب و یابس کو جمع کر دینے کا نام تحقیق نہیں۔ تحقیق کے باب میں جانب داری اور یک رخی تصویر بنا دینا نری بددیانتی ہے جو ایمان کو سوخت کر دیتی ہے۔

۷۔ افکار و خیالات کی آزادی بھی تحقیق نگار کا فطری وصف ہے۔ وہ روایات کو جانچتا، پرکھتا اور ردّ و قدح سے کام لیتا ہے۔ انھیں اپناتا اور قبول بھی کرتا ہے، لیکن وہ روایات کا پجاری، قدامت کا پرستار اور لکیر کا فقیر نہیں ہوتا۔ وہ ذہنی غلامی اور مرعوبیت سے کنارہ کش رہتا ہے۔ وہ حقائق کا جویا اور صداقت کا متلاشی ہوتا ہے۔ وہ فلک الافلاک کی سیر کرتا ہے لیکن تحت الثریٰ کی خبر بھی رکھتا ہے۔ وہ جنبشِ قلم سے حقائق کے چہرے سے پردہ اٹھاتا ہے اور حق سے روشناس ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی روشناس کرتا ہے۔ حق و باطل کا امتیاز اس کی ادنیٰ سی جنبشِ قلم کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن وہ کور ذوق اور بد باطن جنھیں اتنا بھی شعور نہ ہو کہ طبع اول اور جلد اول میں بھی امتیاز نہ کر سکیں، وہ لاکھ محققین کا روپ بھر کے آئیں اور جُل دینا چاہیں وہ ہرگز قابلِ اعتنا نہیں ہو سکتے اور انھیں کوئی محقق نہیں مان سکتا۔ پھر ان کا یہ دعویٰ کہ مخالف و موافق کتب سے تحقیق کر کے لکھا ہے کتنا مضحکہ خیز اور کس قدر لغو ہے۔ اگر کوری جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔ اس سے زیادہ حمق میں مبتلا عقل کے دشمن اور باطل کے طرف دار وہ ہیں جو ایسی حماقت مآب تحریر کو تحقیق سے تعبیر کرتے ہیں اور دنیاوی نام و نمود کے لیے مہرِ تصدیق ثبت کر کے مخلوق کو گم راہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بہر حال تحقیق نگار کو فکر و نظر کی آزادی حاصل ہوتی ہے لیکن مطلق العنانی اس کا وصف نہیں ہوتا بلکہ اسے ہر قدم پر حق و باطل کا امتیاز رکھنا ہوتا ہے اور کہیں کج روی اختیار نہیں کرنی پڑتی، جہاں بھی راہِ راست سے بھٹکے گا گم راہ ہو جائے گا اور پھر اسے حقائق کی جانب عود کرنا پڑے گا۔

۸۔ جذبات کی عکاسی اور واردات کی ترجمانی تحقیق نگار کا فرضِ منصبی ہے لیکن جذبات سے

کھیلنا اس کا وصف نہیں، بلکہ کامل حزم و احتیاط سے کام لینا اس کے لیے اشد ضروری ہے۔ جو تحقیق نگار جذبات پر قابو پانے کا وصف نہیں رکھتا وہ جذبات و توہّمات کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی قلمی کاوش تمام تر جذبات کی دلدل بن کر رہ جاتی ہے، اور اس سے کسی کو بھی فائدہ نہیں پہنچتا، البتہ اس سے عبرت حاصل کی جا سکتی ہے۔

۹۔ بلاشبہ ذوقِ سلیم بھی تحقیق کی راہ میں معاون و مددگار رہتا ہے، جو اہلِ ذوق اور اہلِ نظر میں بقدرِ مشترک پایا جاتا ہے۔ حسن کا معیار مختلف سہی لیکن حسن کا احساس مشترک ہی ہوتا ہے۔ اگر ذوقِ سلیم کا وصفِ مشترک نہ ہو تو کسی مسئلے میں متفق و متحد ہونا بہ منزلہ محال ہو جائے گا۔ البتہ درجات میں فرق ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے اور یہ فرق شغف اور انہماک کی بدولت رونما ہوتا ہے۔ جن امور کی جانب میلان و شغف زیادہ رہے گا ذوقِ سلیم کا وہی رخ زیادہ اجاگر ہوگا اور اسی کے ذریعے فنی الہامات زیادہ ظہور پذیر ہوں گے، باقی پہلو مکدّر رہیں گے یا اس درجے کی جلا اُن پر نہ ہوگی، اور بادی النظر میں ذوقِ سلیم مختلف نظر آئے گا، لیکن یہ خلافِ واقعہ ہے۔ ذوقِ سلیم ہی وہ جذبہ ہے جس کی برکت سے آئین و قوانین وضع ہوتے ہیں اور حق و باطل میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ ادب و تحقیق کی راہ میں ذوقِ سلیم خضرِ راہ کا کام دیتا ہے جو بتدریج ترقی کرتا ہے اور پختہ ہوتا ہے۔

۱۰۔ تحقیق نگار کو زبان پر قدرت اور اسالیبِ بیان سے آگاہی لازم ہے، تاکہ وہ مفہوم و مطالب کو خاطر خواہ ادا بھی کر سکے، اور جن رشحاتِ قلم کو وہ بنیادی طور پر پیشِ نظر رکھنا چاہتا ہے ان کے قلم کاروں اسلوبِ بیان اور خصائصِ قلم سے آگاہ بھی ہو، بلکہ ان پر کامل عبور ہونا چاہیے۔ ان کی علمی منزلت سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ اس سے بھی باخبر رہنا چاہیے کہ وہ کہاں تک اہلِ علم میں مقبول اور مستند ہیں اور ان کی قلمی کاوش کیا منزلت رکھتی ہے۔ ورنہ ذہن دھوکا کھا جاتا ہے یا جنبہ داری مغالطے کی دلدل میں پھنسا مارتی ہے اور ہر مجہول الحال کو مقبول اور ہر معروف الحال کو نامقبول تصور کر لیا جاتا ہے۔ اکثر اوقات یہ نادانستہ طور پر ہوتا ہے ورنہ اگر جان بوجھ کر کوئی اس فعلِ قبیح کا مرتکب ہو تو بسا اوقات سلفِ صالحین کے باب میں سُوء ادبی لازم آتی ہے۔ جو معروف و مقبول ہے اسے کوئی مجہول الحال اور غیر مقبول نہیں بنا سکتا اور جو مجہول الحال اور کور ذوق ہے اسے کسی کا زورِ قلم مقبول و معروف نہیں بنا سکتا۔ نہ زمین، آسمان ہو سکتی ہے اور نہ آسمان کو زمین بنایا جا سکتا ہے۔ چاند پر کون خاک ڈال سکتا ہے۔ ہرن پر کوئی بھی گھاس نہیں لادا کرتا۔ الغرض، اس باب میں اس امر کا لحاظ رکھنا لازم ہے کہ کوئی قلمی کاوش اور کسی کی قلمی کاوش ایسی نہیں جو سہو و خطا سے بالکل ہی پاک اور منزہ ہو۔ ایسا

ہونا شاذ کا حکم رکھتا ہے البتہ تحریر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اغلاط ...کی دلدل نہ ہو جس سے ابتلائے علمی پیدا ہو۔ گویا کہ جو تحریر اس اعتبار سے افضل ہوگی اور گوناگوں اوصاف کی بنا پر مقبول و مستند ہوگی اسے ان تحریروں پر ترجیح اور فوقیت ہوگی جو ان خصائص میں اس سے فروتر ہوں گی۔ لیکن اس ترجیح سے کوئی قلم کاری کلامِ الٰہی کے ہم پایہ نہیں ہوسکتی۔ جو کوئی اپنی کور ذوقی اور ذہنی کاہلی کی بنا پر امتیاز نہیں کرسکتا اور اس ترجیح و فوقیت کو بہ منزلہ کلامِ ربانی تصور کرتا ہے تو وہ اپنی ذہنی گم راہی کا ثبوت دیتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی کسی مقبول و مستند کتاب کو ہدفِ ملامت بناتا ہے اور اہل اللہ کے جرگے میں مقبول و معتبر اہلِ قلم کو جنبہ دار اور حق فراموش قرار دیتا ہے اور کوئی قابلِ قبول دلیل نہیں دیتا وہ غولِ راہ ہے۔ گم راہ بھی ہے اور گم راہ کن بھی ہے۔

بہرکیف اسالیب کی آگاہی سے کسی قلم کار کے رشحاتِ قلم میں الحاق و تحریف کے بدنما جوڑ اور پیوندکاری کو بخوبی شناخت کیا جاسکتا ہے اور متقدمین میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں اور انھوں نے اس وصف کی بدولت پوری جسارت کے ساتھ حق و باطل میں امتیاز کر دکھایا ہے۔

تحقیق نگار کے لیے یہ بھی ازبس کہ ضروری ہے کہ اس کا اسلوبِ بیان موضوع سے متعلق ہو۔ اگر موضوع سنجیدہ اور علمی ہے تو الفاظ و اصطلاحاتِ علمیہ کو تفوق ہوگا۔ اس کے برعکس اگر عامیانہ اور بازاری اسلوب اختیار کیا جائے تو مطالب خاطر خواہ ادا نہ ہوں گے اور مضمون، ہذیان بن کر رہ جائے گا۔ اسلوبِ بیان سے متعلق تفصیل، میں اپنی متداول کتاب ''مضمون نگاری'' میں لکھ چکا ہوں۔ مزید معلومات اس سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

۱۱۔ استدلال اور استخراج میں بھی تحقیق نگار کو پوری احتیاط سے کام لینا ہوتا ہے۔ خلافِ واقعہ اور غلط امور کو نتائج سے تعبیر کرنا بہت ہی شرم ناک اور مضحکہ خیز بات ہے۔ مثلاً حال ہی میں ایک استدلال میری نظر سے گزرا جو سخت مضحکہ خیز ہے اور وہ یہ ہے:

> ''من بعد میاں مجیب الدّین آمدند وایشاں نیز از یارانِ قدیم حضرت مولانا و از اولاد ہمشیرہ زادہ حضرت سلطان المشائخ قدس سرّہ اندالخ ''فخر الطالبین'' صفحہ ۲۳ مجتبائی، دہلی''۔
>
> (ترجمہ) بعدازاں مجیب الدّین آئے اور وہ بھی حضرت مولانا کے قدیم دوستوں اور حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ کے ہمشیرہ زاد کی اولاد سے ہیں۔

اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے:

''گویا کہ چشتیہ نظامیہ سلسلے کے مجدّد کی طرف سے اولادِ خواہر زادہ ہونے کی صریح الفاظ میں تصدیق ہورہی ہے۔ رسالۂ نظامی، اگست ۱۹۵۸ء، ص ۱۲''۔

سوال یہ ہے کہ اس عبارت میں حضرت مولانا سے مراد حضرت مولانا فخر جہاں رحمتہ اللہ علیہ ہیں یا کوئی اور، اگر مولانا فخر جہاں ہیں اور بلاشبہ وہی ہیں تو یہ ارشاد ان کا نہیں، کسی اور کا ہے۔ وہ ہے مؤلفِ کتاب کا نہ کہ حضرت مولانا فخر جہاں کا جو سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے بلاشبہ مجدّد تھے۔ لہٰذا جب یہ ارشاد حضرت مولانا فخر جہاں کا نہیں تو پھر یہ کہنا کہ چشتیہ نظامیہ سلسلے کے مجدد کی طرف سے اولادِ خواہر زادہ ہونے کی صریح الفاظ میں تصدیق ہورہی ہے، سراسر لغو اور باطل ہے بلکہ تہمت ہے حضرت مولانا فخر جہاں رحمتہ اللہ علیہ پر اور یہ دلیل خود دعوے کو باطل قرار دیتی ہے۔ بلاشبہ یہ بیان مولف کا ہے جن کا نامِ نامی سیّد نورالدین حسین فخری ہے اور اس کا اطلاق ان ہی پر ہوسکتا ہے۔ حضرت مولانا فخر جہاں رحمتہ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی کو اس بیان سے متّہم نہیں کیا جاسکتا۔

بہرحال ایسے استدلال سے لازماً پرہیز کرنا چاہیے اور ہرگز ایسا غلط اور لغو نتیجہ نکالنا نہیں چاہیے۔ ایسی باتوں سے تحقیق، نظروں سے گرجاتی ہے، اور تحقیر و ذلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور کوئی منزلت حاصل نہیں کرسکتی، بلکہ مخلوق کی گمراہی کی آفت میں خود قلم کار کو مبتلا ہونا پڑتا ہے۔

۱۲۔ تواتر سے کام شرعی امور میں بھی لیا جاتا ہے اور تاریخ و تنقید میں بھی، لیکن تواتر کی بنیاد بلاشبہ صداقت پر ہوتی ہے اور حقائق پر۔ شریعت میں کسی امرِ حق کا وجود اس کا کوئی قرینہ عہدِ صحابہ رضوان اللہ علیہم میں پایا جائے اور عہد حاضر تک یا زمانۂ زیرِ بحث تک عہد بعہد سلسلہ قائم ہے، یہ ہے شرعی تواتر۔ تاریخ و تنقید کی اصطلاح میں کسی واقعے کا وقوع کسی عہد میں پایا جائے اور اس عہد سے لے کر زمانۂ زیرِ بحث تک عہد بہ عہد اس کے ذکر کا سلسلہ قائم رہے، یہ ہے تاریخی تنقیدی تواتر۔

اگر امرِ واقعہ کی بنیاد حقائق پر نہ ہو تو خواہ عہد بہ عہد اس کا اعادہ ہوتا رہا ہو، اس کو تواتر سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا ورنہ تمام مصائب اور تمام جرائم اور ساری شیطنت تواتر سے متعلق ہوکر استحقاق کی دعوے دار ہوجائے گی۔ اسی طرح اگر کسی امر کا وجود فی الحقیقت نہیں، لیکن اہلِ غرض نے غلط شہرت دے دی، اور عہد بہ عہد اس کا اعادہ ہوتا رہا اور ہر عہد میں وہ تاریخ کے اوراق کی زینت بنتا رہا تو وہ بھی تواتر کی مد میں نہیں آتا اور اس سے کسی استحقاق کے لیے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ تواتر کے لیے پہلے کسی امرِ واقعہ کا وجود کسی عہد میں ثابت کرنا ہوتا ہے۔ بعد ازاں عہد بہ عہد اعادہ و تکرار کو تلاش کرنا ہوتا ہے۔ جب یہ دونوں صورتیں مہیا ہوں تو اس وقت اس سلسلے کو تواتر سے تعبیر کیا جائے گا، ورنہ نہیں۔

(الف) ''بلیک ہول''، کلکتہ سے کون واقف نہیں جس کا ذکر ایک طویل مدت تک چھوٹی بڑی ہر قسم کی کتبِ تاریخ میں جگہ پاتا رہا۔ اس کا وقوعہ ۱۱۹۰ھ/ ۱۷۷۶ء میں بتایا جاتا تھا اور روایت کو اس طرح گھڑا گیا تھا کہ نواب سراج الدولہ والیِ بنگالہ کی فوج کے سپاہیوں نے ایک سو چالیس انگریزوں کو اٹھارہ فٹ مربع کوٹھری میں بند کر دیا تھا۔ جب دوسرے دن کھولا تو صرف تینتیس نفوس زندہ نکلے، باقی سب مر گئے۔ اسی کال کوٹھری کو بلیک ہول کہا جاتا ہے اور یادگار کے طور پر اسے قائم رکھا گیا تھا۔

آں جہانی کامریڈ سبھاش چندر بوس نے تحقیق و تفتیش کے بعد اس کے خلاف آواز اٹھائی اور روایت و درایت سے اس افسانے کا وجود میں نہ آنا ثابت کیا۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے مؤرخ تائید کے لیے نکلے اور خوب خوب زورِ قلم صرف کیا لیکن جھوٹ کو سچ نہ بنا سکے، انجامِ کار اس کا نام و نشان مٹا دیا گیا اور سب سے پہلے کامریڈ سبھاش چندر بوس ہی نے ہتھوڑے کی ضرب اس پر لگائی اور پھر ہاتھوں ہاتھ وہ نیست و نابود کر دیا گیا۔

(ب) ایسا ہی ایک افسانہ وہ ہے جو سومناتھ کے مشہور مندر کے انہدام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور سلطان محمود غزنوی کو اس کا مرتکب قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ بھی تحقیق کی تاب نہ لا سکا۔ اس کا وقوعہ ۴۱۵ھ/۱۰۲۴ء میں بتایا جاتا تھا مگر محمود کی فتوحات میں اس کا کوئی مذکور نہیں۔ حتیٰ کہ دو سو سوا دو سو برس تک تاریخیں اس کے ذکر سے خالی اور اس عہد کے مورخ لاعلم ہیں بلکہ سومناتھ کی آبادی اور مندر کا وجود عہد مابعد میں پایا جاتا رہا ہے۔ حتیٰ کہ حضرت شیخ سعدی شیرازی رحمتہ اللہ علیہ المتوفی ۶۹۱ھ/ ۱۱۹۱ء نے اس کو آباد دیکھا اور بذاتِ خود وہاں قیام فرمایا اور ''بوستان'' میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے۔

چوں کہ اس کی بنیاد صداقت پر نہیں تھی اس لیے یہ کئی صدی پرانا تاریخی اعادہ و تکرار، تواتر کی مد میں نہ آ سکا اور انجام کار یہ قصہ مسترد قرار پایا۔ اس تحقیق کے ہیرو پنڈت سُندر لال جی ۰۰۰ ہیں۔

(ج) ایک تیسرا افسانہ وہ ہے جو علاء الدین اور پدمنی کے تعشق سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ ملک محمد جائسی، سولھویں صدی عیسوی (۹۴۷ھ/ ۱۵۴۰ء) عہدِ لودھی میں ہندی کے مشہور صوفی شاعر ہوئے ہیں۔ انھوں نے ایک مثنوی لکھی ہے جس کا نام ''پدماوت'' ہے، جو بہت مشہور و مقبول مثنوی ہے۔ اس کی زبان اور اس کی بحر، ہندی ہے مگر رسم الخط اُردو ہے۔ مثنویوں میں عموماً طبع زاد افسانے ہوتے ہیں۔ افسانے، انسانی فطرت کے مطابق تو ہو سکتے ہیں لیکن ان کا

حقائق پر مبنی ہونا لازم نہیں۔ شاید ہی کوئی افسانہ حقائق پر مبنی ہو، اور شاید ہی کسی افسانے میں کسی واقعے کو من وعن بیان کیا گیا ہو، ورنہ تمام تر فرضی ہی ہوتے ہیں۔

ملک محمد جائسی نے پدماوت میں جو قصہ نظم کیا ہے اس کے اہم کرداروں کو چتوڑ، رتن سین، پدمنی، علاء الدین اور طوطے سے تعبیر کیا ہے اور خود ہی اس نظم کے آخر میں ان کرداروں کی وضاحت اس طرح کی ہے:

> ''چتوڑ سے مراد جسمِ انسانی ہے — رتن سین سے مراد روح ہے — پدمنی سے مراد عقل ہے — علاء الدین سے مراد وسوسہ ہے — اور طوطے سے مراد گرو ہے —''

اور اس طرح قصے کو تصوّف اور اصلاحِ اخلاق کے رنگ میں رنگ دیا ہے لیکن کچھ افسانہ پسند مورخوں نے اور خصوصاً انگریزی عہد میں انگریز پرست اور فرقہ وارانہ ذہن رکھنے والے تاریخ نویسوں نے اس تمثیلی اور فرضی افسانے کو تاریخی کتابوں میں داخل کر کے ہندو مسلم منافرت کی آگ کو خوب ہوا دی اور اہلِ وطن کو آپس میں لڑا کر گورے آقا کو خوش کرتے رہے لیکن یہ قصہ بھی تاریخ میں مندرج ہونے کے باوجود اور اعادہ وتکرار کے باوجود تواتر کی مد میں نہیں آتا، بلکہ مرفوع القلم اور مسترد ٹھہرتا ہے۔

الغرض تواتر اس عملِ پیہم کا نام نہیں جو حقائق پر مبنی نہ ہو۔ رہی یہ صورت کہ کبھی کسی نے کچھ لکھ دیا اور وہ مدتوں تک کنجِ خمول میں پڑا رہا اور کبھی کبھی اہلِ غرض نے اس کا اعادہ کر لیا، لیکن حقائق پر مبنی نہ ہونے کی بنا پر وہ مقبولیت حاصل نہ کر سکا، تو اس قسم کے اعادہ وتکرار کو تواتر سے تعبیر کرنا کوری جہالت ہے۔ اس کو تواتر سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ تحقیق نگار کو ایسی لغزشوں سے پوری طرح محفوظ رہنا چاہیے۔ یہ خیال بھی بے اصل ہے کہ الحاقات کے جمع کر دینے سے کسی کتاب کی جامعیت کو مزید تقویت پہنچتی ہے۔ اہلِ علم اس خیال کو صحیح نہیں سمجھتے۔ اگر یہ خیال صحیح ہوتا تو ''تاریخِ واقدی'' سب سے زیادہ معتبر سمجھی جاتی اور اہلِ علم اس کی روایات کو مشکوک نظر سے نہ دیکھتے، اور اس کو افسانہ سرا، اور غلط گو نہ بتاتے۔ وقد قال الشافعی کتب الواقدی کذب (تاریخِ بغداد)

تواتر کا مترادف تسلسل کو قرار دینا بھی عوامیت سے علاقہ رکھتا ہے۔ دور وتسلسل فلسفے کی اصطلاح ہے اور اس کو محال قرار دیا گیا ہے۔ تحقیق نگار کو لازم ہے کہ اس کے قلم سے جچے تلے الفاظ نکلیں تاکہ مفہوم کے ادا کرنے میں کسی طرح کا ابہام باقی نہ رہے۔

۱۳۔ تحقیق میں نکتہ چینی سے بھی کام لیا جاسکتا ہے اور طنز وتعریض سے بھی لیکن اس کے لیے

حالتِ اطلاق بہترین حالت ہے۔ کیوں کہ رمز و کنائے میں جو مزہ ہے وہ پھکڑ بازی میں نہیں۔ تحقیق میں عیب وصواب کو بھی ناپا جاتا ہے لیکن ادب کا دامن ہاتھ سے چھوڑا نہیں جاسکتا۔ ایسے مواقع پر رمزیت اور شگفتہ بیانی کے انچھر خوب کام دیتے ہیں۔ دریدہ دہنی اور بے لگامی ادب و تحقیق کا بھاری عیب ہے، اور سخت معیوب ہے۔ تحقیق کی خوبی یہ ہے کہ دائرۂ ادب میں رہتے ہوئے کمال بے باکی اور دیانت داری سے دادِ تحقیق دی جائے۔

بلاشبہ سلفِ صالحین نے اس بات میں انتہائی جسارت اور کمال صاف گوئی سے کام لیا ہے اور بڑی عرق ریزی اور جاں سوزی سے اسماء الرجال کا ایسا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے کہ جس پر بجا طور سے فخر کیا جاسکتا ہے۔ جس کا اعتراف، مخالفینِ اسلام کو بھی ہے۔ چنانچہ جرمن مستشرق ڈاکٹر اسپرینگر، صاحبِ کتاب ''اصابہ فی احوال الصحابہ'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اسماء الرجال پر مسلمان جتنا فخر کریں بجا ہے۔ نہ ایسی قوم گزری ہے اور نہ اب ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح بارہ سو برس تک علماء کے حالاتِ زندگی لکھے ہوں۔ ہمیں پانچ لاکھ مشہور عالموں کا تذکرہ ان کی کتابوں سے ملتا ہے۔''

خواجہ حالی مرحوم ان بزرگوں کے اس کارنامے کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں:

کیا فاش راوی میں جو عیب پایا
مناقب کو چھانا مثالب کو تایا
مشائخ میں جو قبح نکلا جتایا
ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا
طلسمِ ورع ہر مقدس کا توڑا
نہ ملّا کو چھوڑا نہ صوفی کو چھوڑا

اور اگر چہ ان حضرات کا موضوع انتہائی مقدس اور قابلِ صد احترام ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے وہ اسلوب اختیار کیا کہ ان پر حرف نہیں آسکتا۔ تاریخی تحقیق کا گو منصب نہیں، بلکہ فروتر ہے، اور وہ صرف ترجیح اور ظنِ غالب کا فائدہ بخشتا ہے، جو بتدریج ایقان کے درجے کو پہنچ سکتا ہے۔ تاہم غلط بیانی اور ایسی صاف گوئی جو دریدہ دہنی کی مصداق ہو، تحقیق کے آئین میں کسی طرح بھی روا نہیں، بلکہ قبیح اور مکروہ ہے۔ لہٰذا کسی کو ضّاع و کذّاب ثابت کرنے سے افضل یہ ہے کہ ایسا اسلوب اختیار کیا جائے کہ زبانِ قلم، مکروہات کی غلاظت سے آلودہ نہ ہو، اور شخصیت کا صحیح پرتو سامنے آجائے

اور نتیجہ خاطر خواہ ذہن نشین ہو جائے۔ یہ انشاء پردازی کا کمال ہے۔ لیکن جنھیں زبان وقلم پر قدرت نہیں، ان سے یہ بات بن نہیں آتی۔ وہ پھکو بازی ہی کو اہم جانتے ہیں اور یہ صحیح نہیں۔ تحقیق نگار کو ایسے امور سے مجتنب رہنا چاہیے۔

۱۴۔ طمانیتِ خاطر کے لیے یہ وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ ان اصول کی بنیاد ناقابلِ تردید حقائق پر ہے۔ لہٰذا ان سے متعلق بعض اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں:

☆ یا ایها الذین امنوا ان جاء کم فاسق بنباء فتبینوا۔ (سورۃ الحجرات)

(ترجمہ): مسلمانو! اگر تمھارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو اچھی طرح اس کی تحقیق کر لو۔

☆ ولا تطع کل حلاف مهین هماز مشاء بنمیم مناع للخیر معتداثیم عتل بعد ذالک زنیم ان کان ذامال و بنین (سورۃ قلم)

(ترجمہ): اور اس شخص کے کہنے میں نہ آنا جو بات بات پر حلف اٹھاتا ہے، آبرو باختہ ہے، طاعن ہے، چغل خوری کرتا ہے، اچھے کاموں سے روکتا ہے، حد سے بڑھ گیا ہے، بد ہے، بدخو ہے، اور ان سب باتوں کے ساتھ جھوٹا نسب بتاتا ہے، اس لیے کہ وہ مال دار ہے اور لڑکوں والا ہے۔

☆ کلا لئن لم ینته لنسفعاً بالناصیة ناصیةٍ کاذبة خاطئة (سورۃ علق)

(ترجمہ): وہ سن رکھے کہ اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے جو جھوٹی ہے اور خطا کار ہے۔

☆ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سامنے جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بیان کی گئی:

ان المیت لیعذب ببکاء الحی۔

(ترجمہ): مُردوں پر نوحہ کیا جائے تو ان پر عذاب کیا جاتا ہے۔

تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

انّ کم لتحدثون عن غیر کاذبین ولا مکذبین ولکن السمع یخط (صحیح مسلم کتاب الجنائز)

(ترجمہ): تم لوگ نہ خود جھوٹے ہو، نہ تمھارے راوی جھوٹے ہیں لیکن کان غلطی کر جاتے ہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا:

اما انه لم یکذب ولکنه نسی او اخطاء

(ترجمہ): ہاں! وہ جھوٹ نہیں بولے لیکن بھول گئے یا خطا کی۔

علامہ مازریؒ ایک حدیث کی نسبت فرماتے ہیں:

اذا انسدت طرق تاویلها نسبنا الکذب الی رواتها (نووی شرح مسلم کتاب الجہاد)

(ترجمہ): جب اس حدیث کی تاویل کے سب رستے رک جائیں گے تو ہم راویوں کو جھوٹا کہیں گے۔

''صحیح مسلم'' کے مقدمے میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سامنے حضرت علی کرم اللہ وجہ کے قضایا یعنی مقدمات کے فیصلے پیش کیے گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس کی نقل لیتے جاتے تھے اور بعض بعض فیصلے چھوڑتے جاتے تھے اور فرماتے تھے:

یا اللہ ماقضیٰ بهذا علی الا ان یکون ضل

(ترجمہ): خدا کی قسم علی رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ کیا ہے تو گم راہ ہو کر کیا ہے (لیکن چوں کہ وہ گم راہ نہیں تھے اس لیے یہ فیصلہ بھی نہ کیا ہوگا)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے صرف ان فیصلوں کے مضمون سے یہ قیاس کرلیا کہ وہ صحیح نہیں ہو سکتے۔ اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ روایت اور سند کا پتا چلائیں اور انھیں صناع اور کذاب قرار دیں اور پھر مسترد کریں۔

☆قال ابن الجوزی و کل حدیث رایته یخالفه العقول ادبناقض الاصول فاعلم انه موضوع فلایتکلف اعتباره ای لا تعتبر رواتهُ ولا تنظر فی جرحهم... ولذا جعل بعضهم ذلک دلیلاً علی کذب راویة و کل هذا من القرائن فی المروی وقد تکون فی الراوی (فتح المغیث، ص۱۱۴)

(ترجمہ): ابن جوزی نے کہا ہے کہ جس حدیث کو دیکھو کہ عقل یا اصولِ مسلّمہ کے خلاف ہے تو جان لو کہ وہ مصنوعی ہے اس کی نسبت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں... اور اس لیے بعض (محدثین) نے اس ''لغویت'' کو راوی کے کذب کی دلیل قرار دیا ہے اور یہ تمام قرینے خود روایت سے متعلق اور راوی کے متعلق بھی ہو جاتے ہیں۔

فیلحقه تهمة تبدیل المعنی فی روایته قبل الحفظ اوقبل العلم حین سمع (فتح المغیث، ص۱۲۱)

(ترجمہ): اسی بنا پر سنتے وقت قلتِ حفظ یا قلتِ علم کے سبب سے روایت کے ادا کرنے میں راوی پر مفہوم کے بدل دینے کا شبہ ہو سکتا ہے۔

فاذا کان الراوی غیر فقیه احتمل الخطا فی فهم المعنی المرادی الشرعی ... ولایلزم نسبة الکذب الخ (ص۴۳۲، شرح مسلم)

(ترجمہ): جب راوی فقیہ نہ ہوگا تو احتمال ہوگا کہ اس نے معنی مقصود شرعی کے سمجھنے میں غلطی کی ہو... (لیکن) کذب کی نسبت لازم نہیں آتی۔

حافظ ابن حجر مکیؒ ایک حدیث کے متعلق فرماتے ہیں:

ان الاخبار التی تشاع ولو کثر ناقلوها ان لم یکن مرجعها الی امر حسی من مشاهدة او سماع لاتستلزم الصدق (فتح الباری، جلد۹، ص۲۵۷)

(ترجمہ): جو خبریں شائع ہو جاتی ہیں خواہ ان کے راوی کثرت سے ہوں، لیکن ان خبروں کی بنیاد امر حسی یعنی مشاہدہ یا استماع نہ ہو تو ان کا سچا ہونا ضروری نہیں۔

ماخذ:

''ارمغانِ تحقیق''، شائع کردہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی، طبع اوّل ۱۹۵۹ء، ص۴۹ تا ۶۰۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل

اُردو میں لسانی تحقیق: روایت اور مسائل ☆

اُردو میں روایتی اور تاریخی اصولوں کے تحت لسانی تحقیق کا آغاز حافظ محمود شیرانی اور نصیر الدین ہاشمی سے ہوتا ہے۔ پھر اگرچہ وحید الدین سلیم اور پنڈت کیفی نے اس میں مفید اضافے کیے، لیکن جدید علمِ زبان سے استفادے کے بعد ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور عبدالقادر سروری نے اس ضمن میں وقیع کام کیے۔ بعد میں اس کام کو ڈاکٹر مسعود حسین خان نے جدید سائنٹی فک اصولوں کی روشنی میں آگے بڑھایا۔ ان کے ساتھ اس کام میں ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ شریک ہو گئے۔ لیکن دراصل اُردو کے جدید لسانی مطالعے میں سب سے اہم اور اولین نام ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا ہے جنھوں نے ۱۹۲۹ء میں لندن میں ''ہندوستانی صوتیات'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا، پھر پیرس میں ہندوستانی کے گجراتی اسالیب پر بھی مقالہ لکھنا شروع کیا تھا، لیکن اسے پورا نہ کر سکے۔ اس وقت تک نہ صرف اُردو بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی جدید لسانیاتی مطالعے کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ مگر اس کے باوجود اب لسانیات کے باب میں اُردو، بقولِ ڈاکٹر گیان چند 'ہندی سے پچیس سال پیچھے ہے''۔ حالاں کہ ۱۹۲۸ء تک محض شیام سندر داس کی ''بھاشا وگیان'' ہندی لسانیات کی کل کائنات تھی۔

☆ یہ مقالہ دراصل اس توسیعی خطبے پر مبنی ہے، جسے مقالہ نگار نے اوسلو یونیورسٹی (ناروے) میں ۲۲/ اپریل ۱۹۸۷ء کو ''شعبۂ زبانہائے شرقی'' کی دعوت پر دیا تھا۔

ڈاکٹر زورؔ کے بعد ڈاکٹر مسعود حسین خان، انور شبنم دل، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے جدید لسانیات کے اصولوں اور وسائل کو اُردو کی لسانی اور صوتی تحقیق میں استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اُردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں ڈاکٹر مسعود حسین خان اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کے جدید علمِ لسانیات کے حامل شعور نے اُردو کی لسانی تحقیق و مطالعے کی تاریخ میں اپنے مدلل مباحث کے ذریعے صراطِ مستقیم دکھائی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اُردو کی لفظی تشکیل پر جو تحقیق و تجزیاتی مقالہ "A Phonetic and Phonological Study of a Word" لکھا، وہ بہت قابل قدر تھا۔ اس عرصے میں ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے اس نوع کے مقالات بھی اُردو لسانیات کے باب میں اہم اضافوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اُردو زبان، قواعد اور لغات کے تعلق سے اس دوران جو تحقیقی مقالات بھارت اور پاکستان کے مختلف اصحابِ علم نے لکھے، ان میں بھی کہیں کہیں جدید لسانی شعور کا استعمال نظر آتا ہے۔ غیر ممالک میں ایسی کوششیں زیادہ وقیع اور سائنٹی فک بنیادوں پر ہوئیں۔ اس موضوع پر زیادہ مستقل کام روس کے مختلف لسانی تحقیق کے مراکز میں ہوا۔ روسی ماہرین نے اُردو کی صرفی ونحوی خصوصیات کے تعین میں مستقل اہمیت کے مقالات لکھے۔ یہ سب کوششیں حال کی ہیں، جن میں اُردو کے لسانیاتی مطالعے کو اہمیت دی گئی ہے۔ افسوس کہ پاکستان میں اس نوع کی کوششیں بہت کم ہوئی ہیں۔ جدید لسانیاتی مطالعے اور تجزیے کی ایک موثر اور مستقل کوشش انور شبنم دل نے ضرور کی ہے، جو "Linguistic Research Group of Pakistan" کے داعی اور اس کے سب سے فعال رکن بھی رہے ہیں۔ انھوں نے پاکستان میں جدید لسانیات کے مطالعے کو فروغ دینے کی اپنی بساط بھر بڑی مثبت کوششیں کیں، کئی مطالعے کیے، اور لسانی مطالعوں پر مشتمل کئی مجموعۂ مقالات شائع کیے۔ انھوں نے اپنے ان مقاصد کے تحت پاکستانی لسانیات کے مطالعے کا جو ایک محدود لیکن مفید حلقہ تشکیل دیا تھا، اس سے وابستہ ماہرینِ لسانیات نے مختلف نوع کے تحقیقی و تجزیاتی مطالعے کیے۔ خود انور شبنم دل نے جدید لسانیاتی اصولوں اور طریقۂ کار کی مدد سے اُردو جملوں کی ساخت کے موضوع پر ایک مبسوط مقالہ "An out line of Urdu sentence structure" تصنیف کیا۔ افسوس کہ انھوں نے اس نوع کے چند کام کرنے کے بعد پاکستان کو خیر باد کہہ دیا۔ پاکستان میں اس نوع کا کوئی اور اجتماعی کام پھر کبھی نہ ہوا۔ واحد انفرادی کوشش جو جدید لسانیاتی مطالعے کے باب میں اُردو کے تعلق سے ہوئی، وہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے انجام دی۔ اُردو کے ماہرینِ لسانیات

میں سے حافظ محمود شیرانی وغیرہ نے جو کام کیے تھے، وہ ایک لحاظ سے محض لسانیاتی پہلوؤں کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش تھیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے علمِ لسانیات پر اپنے مضامین کے ذریعے توضیحی لسانیات اور صوتیات پر لکھنے کی ابتدا کی۔ لسانیات سے ان کی یہ دل چسپی روز افزوں رہی، چنانچہ انھوں نے ۱۹۴۸ء میں ''لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز'' سے منسلک ہو کر شمالی ہند میں ہند آریائی زبانوں کا ارتقاء'' کے موضوع پر اپنے تحقیقی کام کا آغاز کیا۔ اس مطالعے کا مقصد یہ تھا کہ ایک طرف ہند آریائی زبانوں کے قدیم ترین نمونوں کا دردستان کی زبانوں ''شینا '' وغیرہ سے سراغ لگانے کی کوشش کی جائے اور دوسری طرف پنجابی، سندھی، اُردو وغیرہ کے لسانی پس منظر کا مطالعہ کیا جائے۔

لسانی تحقیق کے ضمن میں ایک تو وہ کام اہمیت رکھتا ہے جو اُردو کے آغاز کے نظریے اور اس کی علاقائی حد بندی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کام کا آغاز ۱۹۲۳ء میں اس وقت ہوا تھا جب نصیر الدین ہاشمی نے ''دکن میں اُردو'' شائع کی تھی اور اس میں انھوں نے دکن کو اُردو کا مولد قرار دیا۔ پھر محمود شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی، جس میں انھوں نے پنجاب کو اُردو کے آغاز کی سرزمین ثابت کرنے کوشش کی۔ ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد اُردو زبان کے آغاز کے ضمن میں محققین میں اس سمت میں مطالعہ و تحقیق کا رجحان پیدا ہوا۔ برعظیم کے تقریباً تمام علاقوں میں اُردو کے ارتقاء اور ان کی اُردو خدمات کا تحقیقی جائزہ لیا جانے لگا۔ اس ضمن میں ''میسور میں اُردو''، ''مدراس میں اُردو''، ''بنگال میں اُردو''، ''بھوپال میں اُردو''، ''بمبئی میں اُردو''، ''بہار میں اُردو''، ''گجرات میں اُردو''، ''سندھ میں اُردو''، ''ناگ پور میں اُردو''، ''یوپی میں اُردو'' جیسے جائزے مرتب ہونے لگے۔ محققین نے ہر علاقے کے قدیم ادب کو بڑی محنت سے تلاش کر کے ادبی دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس طرزِ تحقیق سے اُردو زبان کے قدیم ادب کا بیش قیمت سرمایہ دریافت ہوا اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

پروفیسر محمود شیرانی نے اپنے معاصرین کے مقابلے میں اُردو لسانی تحقیق کا فی الحقیقت بہت بڑا کارنامہ انجام دیا اور اُردو کی ابتدا کے موضوع پر سنجیدہ تحقیق کا راستہ ہموار کیا۔ ان کی تحقیق کے مطابق اُردو پنجاب کے علاقے میں وجود میں آئی اور اس کی ابتدائی شکل ہریانی زبان ہے۔ اور چوں کہ نواحِ دہلی کی تمام بولیاں مسلمانوں کی فتحِ دہلی سے فروغ پاتی ہیں اور مسلمان پنجاب سے ہو کر دہلی جاتے رہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں گے۔

بعد میں ہریانی پر ڈاکٹر زورؔ نے بھی اپنی مؤقر تصنیف ''ہندوستانی لسانیات'' (۱۹۳۲ء) میں زور دیا۔ ان کے بعد ڈاکٹر مسعود حسین خان نے ''مقدمۂ تاریخ زبان اُردو'' (۱۹۴۷ء) میں یہ ثابت کیا کہ ہریانی زبان پرانی اُردو کی باقی ماندہ شکل نہیں بلکہ ایک علاحدہ اور مستقل زبان کی حیثیت سے عرصے سے مضافاتِ دہلی میں رائج تھی۔ ڈاکٹر صاحب کھڑی بولی کو اُردو کی بنیاد قرار دیتے ہوئے اپنے تحقیقی نتائج تک پہنچے تھے۔

گذشتہ نصف صدی میں اس موضوع پر ایک بڑا وقیع کام ڈاکٹر شوکت سبزواری نے کیا۔ ان کی تصنیف ''اُردو زبان کا ارتقاء'' (ڈھاکا، ۱۹۵۶ء) اپنے موضوع پر نئی سمتوں کا تعین کرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس میں محمود شیرانی اور مسعود حسین خان دونوں سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا نظریہ وضع کیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق مغربی ہندی، جس کو کھڑی بولی اور برج کا ماخذ بتایا جاتا ہے، ایک فرضی اور خیالی زبان ہے۔ اس علاقے میں کبھی کوئی مشترک زبان رائج نہیں رہی۔ ''پرتھوی راج راسو'' کی زبان برج بھاشا ہے — قدیم ہندی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ:

''اُردو کی صرفی ونحوی خصوصیات پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو کا ماخذ شورسینی پراکرت یا اپ بھرنش نہیں — اُردو، ہندوستانی یا کھڑی بولی، قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک ہے، جو ترقی کرتے کرتے اس حالت تک پہنچی ہے، جس میں آج ہم اسے دیکھتے ہیں۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ پالی اس کی ترقی یافتہ ادبی اور معیاری شکل ہے۔ اُردو اور پالی کا منبع ایک ہے۔ پالی، ادب، فن اور فلسفے کی زبان ہے اور ہندوستانی، روزانہ بول چال، لین دین اور کاروبار کی۔ پالی ادبی زبان کا درجہ پاکر ٹھہر گئی، لیکن ہندوستانی عوام کی زبان ہونے کی وجہ سے برابر بنتی سنورتی اور ترقی پاتی رہی''۔

جن دیگر حضرات نے اُردو کے آغاز اور اس کے مولد پر اظہارِ خیال کیا ہے، ان میں پیر حسام الدین راشدی بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک مقالے ''اُردو زبان کا اصلی مولد سندھ'' (مشمولہ ''اُردو'' کراچی، اپریل ۱۹۵۱ء) میں سندھ کو اُردو کا اولین مولد قرار دیا ہے۔ اس نظریے کو اوّلاً سیّد سلیمان ندوی نے پیش کیا تھا، لیکن انھوں نے یہ کہہ کر کہ ''سندھ، پنجاب اور دکن میں جو زبانیں بنیں وہ اُردو نہیں بلکہ بالترتیب سندھی، پنجابی اور دکنی تھیں'' اپنے نظریے سے رجوع کرلیا تھا۔ فاضل مقالہ نگار کے نظریے کا ماحصل یہ ہے کہ سندھ میں سب سے پہلے مسلمانوں کو برعظیم کی دیگر اقوام سے ملنے اور پھر ربط ضبط بڑھانے کا موقع ملا تھا اور یہیں سب سے پہلے ان کی عربی زبان، دیسی زبان سے

خلط ملط ہوئی۔ عین الحق فرید کوٹی نے اس موضوع پر اپنی ایک ضخیم تصنیف ''اُردو زبان کی قدیم تاریخ'' (لاہور، ۱۹۷۲ء) میں اس نقطۂ نظر میں اس حد تک اضافہ کیا کہ پنجابی، سرائیکی اور سندھی تینوں وادیِ سندھ کی زبانیں ہیں، لہٰذا پنجابی اور سرائیکی، سرائیکی اور سندھی، سندھی اور پنجابی میں ایک قریبی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان کے خیال میں اُردو، سنسکرت سے نہیں نکلی بلکہ اس کا سرچشمہ وادیٔ سندھ کی قدیم زبان ہے اور اُردو، پنجابی سے نکلی ہے۔ ان کی مراد یہ ہے کہ وادیٔ سندھ کی قدیم زبان، پنجابی ہے لہٰذا وہی اُردو کا سرچشمہ ہے۔

اُردو کے آغاز اور اس کے مولد کے نظریے، جو مرزا جان طپش سے مسعود حسین خان، سہیل بخاری اور شوکت سبزواری تک، کسی حتمی فیصلے یا نتیجے تک نہ پہنچ سکے تھے اور اگرچہ دلائل قوی اور واضح بھی تھے لیکن مکمل اتفاق کسی ایک نظریے پر اب تک نہیں ہے۔ اس صورتِ حال میں ابھی حال میں ڈاکٹر خالد حسن قادری نے مذکورہ سارے نظریات کو باطل قرار دے کر ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے کہ اُردو زبان کا تعلق ہند آریائی زبانوں کے خاندان سے نہیں اور نہ پراکرت کا تعلق سنسکرت سے ہے۔ ڈاکٹر قادری نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آریاؤں کی ہندوستان آمد سے پہلے بھی پراکرتیں مغربی ہندوستانی (پنجاب، سندھ) میں مروج تھیں، اس لیے پراکرت کا تعلق سنسکرت سے نہیں ہوسکتا، جو آریاؤں کے ساتھ ہندوستان آئی تھی۔ پراکرت اپنے قواعد کے لحاظ سے عربی زبان کے زیادہ قریب ہے اس لیے یہ ان قبائل کی زبان ہوسکتی ہے جو مشرقِ وسطیٰ سے سفر کر کے کئی صدیوں میں مغربی ہندوستان میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ لہٰذا اُردو زبان کی بنیاد عربی سے متاثرہ پراکرت ہوسکتی ہے اور پنجاب، سندھ اور صوبۂ سرحد کا علاقہ اُردو کی جائے پیدائش ہوسکتا ہے۔

دراصل اُردو کی ابتدا کے بارے میں جو اولین بیانات ملتے ہیں، ان میں میر امن دہلوی کا بیان پہلا بتایا جاتا ہے۔ میر امن نے ''باغ و بہار'' کے مقدمے میں اُردو زبان کے آغاز کا ذکر کیا تھا۔ ''باغ و بہار'' ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی تھی، لیکن ڈاکٹر عندلیب شادانی نے مرزا جان طپش کے کلیات کے دیباچے کا، جو فارسی میں ہے، اُردو ترجمہ کیا تھا۔ طپش نے اپنا کلیات ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۳ء) میں مرتب کر لیا تھا۔ اس دیباچے میں اس نے دہلی پر مسلمانوں کے قبضے سے قبل ہندی الاصل زبانوں کے بولے جانے کا ذکر کیا اور پھر مسلمانوں کے قبضے کے بعد اس میں تغیرات رونما ہونے، عربی و فارسی الفاظ شامل ہونے، پھر محمد شاہ تغلق کے ساتھ مسلمانوں کے دکن جانے اور پھر واپس دہلی آنے کے سبب اس زبان میں دکنی الفاظ کے شامل ہونے پر اظہارِ خیال کیا ہے اور ان تصرّفات کی مثالیں دی ہیں جو شعراء نے اس زبان

میں کیے۔ اس دیباچے میں طپش نے شعرِ ہندی کو ''ریختہ'' کہنے اور اُردو کی وجہِ تسمیہ بھی بیان کی ہے۔ ڈاکٹر شادانی کی اس کاوش سے یہ بات سامنے آئی کہ میر امن سے پہلے اُردو کے آغاز کے بارے میں اظہارِ خیال ہو چکا ہے۔ لیکن کچھ عرصے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی کی کاوش سے محمد باقر آگاہ کا ''دیباچہ گلزارِ عشق'' منظرِ عام پر آیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ طپش کے دیباچے سے بھی پہلے آگاہ نے برج بھاشا کو اُردو کی اصل بتایا ہے۔ ان قدیم بیانات سے قطع نظر محمد حسین آزاد نے پہلی بار اُردو کی ابتدا و ترقی کے موضوع پر غور و فکر کے بعد مبسوط اظہارِ خیال کیا۔ ان سے قبل انشاء اللہ خاں انشاؔ نے اپنے لسانی شعور کے تحت اُردو کی بولیوں کا جائزہ لیا تھا۔

اُردو کے آغاز و مولد پر تحقیق کے علاوہ محققین کے لیے جو ایک اور موضوع بہت اہم رہا ہے، وہ اُردو کا رشتہ دوسری زبانوں سے ہے۔ اُردو اور پنجابی کی لسانی مشابہتوں پر محمود شیرانی نے تفصیل سے روشنی ڈالی تھی اور اس ضمن میں ان کی زیادہ توجہ اُردو، پنجابی اور برج بھاشا کے تقابلی جائزے پر مرکوز تھی۔ اُردو اور پنجابی کے رشتے پر ڈاکٹر زورؔ نے بھی مفصل روشنی ڈالی ہے۔ پنڈت کیفیؔ بھی ان دونوں زبانوں میں مضبوط باہمی رشتے کے قائل تھے۔ ان کے مقابلے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں اُردو کا رشتہ پنجابی کے ساتھ ساتھ ہریانی سے بھی ملاتے ہیں۔ اور پھر وہ موجودہ پنجابی اور موجودہ ہریانی کا مقابلہ قدیم دکنی سے کر کے نتائج اخذ کرتے ہیں، جو ڈاکٹر زورؔ کے خیال میں ان کی اہم فروگزاشت ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اُردو کا تعلق پالی سے استوار کیا ہے۔ اس طرح لسانی رشتوں، مماثلتوں اور اختلافات کی تلاش و تحقیق کا سلسلہ ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے ان محققین کے پیشِ نظر رہا ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری، جنھوں نے اُردو لسانیات، اُردو کے آغاز اور اشتقاقیات میں مستقل دل چسپی لی ہے، قدیم دکنی اور اُردو کا تقابلی مطالعہ بھی کیا اور صوتیات اور صرف و نحو کا مفصل تجزیہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ دکنی، اُردو سے الگ ایک آزاد اور مستقل زبان ہے، جسے انھوں نے بیجاپوری قرار دیا اور جو آج بھی بیجاپور میں سنی جا سکتی ہے۔ یہ زبان اپنی پڑوسن ''کونکنی'' سے بہت زیادہ ملتی ہے۔ کونکنی، بمبئی کے جنوب میں بھارت کے مغربی ساحل کی زبان ہے اور مرہٹی کی ایک اہم شاخ کہی جا سکتی ہے۔ یہ کونکنی زبان اپنی صوتیات کے اعتبار سے دکن میں اور چند خصوصیات کے باعث پورے ہندوستان میں اہمیت رکھتی ہے۔ بیجاپوری اور کونکنی قربِ مکانی کے باعث بہت کچھ مشابہت رکھتی ہیں۔ چنانچہ دکنی کی بہت سی ایسی خصوصیات جنھیں آج تک پنجاب کا تصرف سمجھا جا رہا ہے،

دراصل خود بیجاپوری کی مقامی خصوصیات ہیں جو کوکنی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان کے خیال میں تاریخی واقعات کی مدد سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پنجابی، ہریانی وغیرہ زبانوں نے دکن کی متعدد زبانوں کو جنم دیا۔ دوسری طرف اُردو اور دکنی کی مشابہت، جس کے باعث ان میں قدیم وجدید کا تعلق فرض کیا گیا ہے، صرف اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں ہی، زبانوں کے مہاراشٹری گروہ سے تعلق رکھتی ہیں، اس لیے دونوں میں نہ صرف دراوڑی بلکہ مہاراشٹری ہونے کے لحاظ سے بھی بہت کچھ مشترک ملتا ہے۔

اسی نہج پر محققین نے اُردو کا سندھی، ملتانی، کشمیری، ہندکو، براہوی، پشتو اور راجستھانی سے لسانی اشتراک و اختلاف کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے۔

مشترک خصوصیات کے ساتھ ساتھ مشترک الفاظ کی تلاش بھی محققین کی دل چسپی کا موضوع بنی ہے اور زبانوں کے اشتراک کے مطالعے کا ایک اگلا قدم اُردو کا غیر ملکی زبانوں سے رشتہ اور تعلق ہے۔ اس ضمن میں ترکی اور اُردو کے مشترک عناصر کی نشان دہی کا کام ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے انجام دیا۔ اوّلاً انھوں نے ترکی اور اُردو کے مشترک عناصر کا تحقیقی مطالعہ کیا اور پھر مشترک الفاظ کی فہرست مرتب کی۔ اسی سلسلے میں ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ اور ڈاکٹر محمد صابر نے ترکی اور اُردو کے تعلق پر متنوع مقالات تحریر کیے اور ان دونوں کے روابط پر محققانہ روشنی ڈالی۔

دوسری زبانوں سے اُردو کی اثر پذیری کے تعلق سے ڈاکٹر عبدالحق کے مبسوط تحقیقی مقالے ''فارسی شاعری کا اثر اُردو شاعری پر'' کا ذکر کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ مقالہ زبان کے ساتھ ساتھ ادبی اثرات کے جائزے پر مشتمل ہے۔ اس نوعیت کا ایک منفرد اور قابلِ قدر کارنامہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ''اُردو میں قرآن و حدیث کے محاورات'' پر محققانہ نظر ڈالی ہے۔ ان کی تصنیف دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ حصّۂ اول میں قرآنی محاورات اور حصّۂ دوم میں حدیث کے محاورات کو اُردو میں استعمال کرنے کی روایت کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ قرآنی محاورات کے ذیل میں ڈاکٹر صاحب نے اسماء الحسنیٰ کی مناسبت سے صرف ۹۹ محاورات کا انتخاب کیا ہے اور پھر یہ دکھایا ہے کہ اُردو ادب میں کس کس شاعر نے ان محاورات سے استفادہ کیا ہے۔ اس طرح حدیث کے محاورات کے ضمن میں قرآنی سورتوں کی تعداد کی مناسبت سے ۱۱۴ محاورات کا انتخاب کیا ہے اور پھر ان سے اُردو شعرا کے استفادے کی مثالیں دی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ کام اُردو زبان کے متعلق تحقیق میں ایک منفرد کارنامے کے ذیل میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی ضمن میں قرآن و حدیث کے

صنائع و بدائع کا بھی مطالعہ کیا ہے اور تحقیق میں موضوعات کی انفرادیت کی ایک مثال قائم کی ہے۔ ان موضوعات پر کسی اور نے توجہ نہیں دی۔ اُردو زبان و ادب کی اثر پذیری کے ذیل میں ڈاکٹر صاحب کا ایک اور مقالہ ''ثقافتی اُردو'' ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے کمالِ تحقیق و جستجو سے یہ دکھایا ہے کہ اُردو زبان میں ہندوستانی اثرات کس حد تک کارفرما رہے ہیں اور الفاظ و محاورات پر ہندو مذہب، تہذیب اور افکار کی چھاپ کہاں کہاں نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ ان کے وسیع مطالعے اور ان کی تلاش و تحقیق کا منفرد ثبوت ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے اُردو کی اثر پذیری کے ساتھ ساتھ اثر اندازی کا بھی ایک مطالعہ کیا ہے ان کا مقالہ ''فارسی پر اُردو کا اثر'' اپنے موضوع پر ایک بہت جامع اور معلوماتی و تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس نوع کی ایک کوشش ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی کی تھی اور ''قدیم عربی تصانیف میں ہندوستانی الفاظ'' کا سراغ لگایا تھا۔ لیکن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا مقالہ زیادہ مبسوط اور جامع ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق جس طرح اُردو، فارسی سے متاثر ہوئی ہے اسی طرح اس نے فارسی کو بھی متاثر کیا ہے۔ کم از کم پانچویں صدی ہجری میں اُردو کے الفاظ فارسی میں تواتر کے ساتھ ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے عہد بہ عہد فارسی شاعروں کے ہاں اُردو الفاظ تلاش کیے ہیں اور ساتھ ہی لسانی و ادبی اثرات کی نشان دہی کی ہے اور پھر وہ تاریخی اسباب بھی بتائے ہیں، جن کے زیرِ اثر فارسی شاعروں نے اُردو الفاظ استعمال کیے۔ اسی ذیل میں فارسی شاعری میں ہندوستان کے تہذیبی و معاشرتی لوازمات کا ذکر اور اُردو کے محاورات کے استعمال کا جائزہ بھی لیا ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے الفاظ کے تلفظ، املا اور معانی کی تبدیلیوں پر بھی محققانہ نظر ڈالی ہے۔

اسی نہج پر ایک کوشش سکھوں کی مقدس کتاب ''گرو گرنتھ'' میں اُردو الفاظ کی تلاش ہے۔ یہ کام عباداللہ گیانی نے کیا اور اپنی تصنیف ''گرو گرنتھ اور اُردو'' میں گرنتھ سے ایسے شبد اور اشلوک جمع کیے، جن سے اُردو کی ابتدائی شکل معلوم کرنے میں مدد ملتی ہے اور اس امر کا پتا چل سکتا ہے کہ اُردو نے کس طرح کے تشکیلی مراحل طے کیے ہیں۔ تصنیف کا بڑا حصہ ان عربی و فارسی الفاظ کی فہرست پر مشتمل ہے جو گرو گرنتھ میں استعمال ہوئے ہیں۔

اُردو زبان کے قدیم نمونوں کو تلاش کرنے کا کام ادبی تاریخوں میں بھی ہوا ہے لیکن وہ نمونے عموماً ادب کے ہیں، اور بالعموم مسلمان شاعروں سے منسوب ہیں۔ جب سے یہ خیال ہوا ہے کہ اُردو کی داغ بیل مسلمانوں کی آمد سے قبل پڑ چکی تھی، ہندوستان کی قبل از اسلام زبانوں میں اُردو الفاظ کی

تلاش و تحقیق کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ بعض محقق اس کام میں پیش پیش رہے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اس کام کو خصوصی اہمیت دے کر ''رِگ وید'' سے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے، جو صرفی اور نحوی اعتبار سے اُردو کے ابتدائی الفاظ کہے جاسکتے ہیں۔ اپنے مقالے ''اُردو کی زبان کا آغاز'' میں انھوں نے ان شواہد کے ساتھ ساتھ کہ اُردو مسلمانوں کی آمد سے قبل برِ عظیم میں موجود تھی، ''رِگ وید'' میں شامل اُردو الفاظ کی مختلف ابتدائی صورتوں کو فہرست وار ترتیب دیا ہے۔ یہی کام انھوں نے زیادہ مبسوط انداز میں ایک ضخیم تصنیف ''اُردو کی کہانی'' کی صورت میں انجام دیا ہے۔ اس میں انھوں نے ویدک اور سنسکرت سے اُردو الفاظ ڈھونڈ کر نکالے ہیں اور پھر عہد بہ عہد اس کے نمونے جمع کیے ہیں۔ پھر اس نوعیت کا ایک کام پروفیسر سید شبیر علی کاظمی نے انجام دیا۔ انھوں نے ''پراچین اُردو'' میں بنگالی اشلوکوں اور دوہوں میں قدیم اُردو عناصر تلاش کرنے کی کوشش کی۔

قدیم لغات میں اُردو الفاظ کی تحقیق بھی ایک اہم موضوع ہے۔ اس جانب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے توجہ دی۔ ان کا مقالہ ''چند قدیم لغات'' اُردو کے مختلف ناموں ہندوی، ہندی وغیرہ کے ذکر سے شروع ہوتا ہے اور پھر چار قدیم لغات ''ادات الفضلا'' مولفہ قاضی خان بدر محمد، ''مفتاح الفضلا'' مولفہ محمد ابن داؤد، ''موئد الفضلا'' مولفہ محمد امین اور ''دستور الصبیان'' مولفہ نا معلوم میں قدیم اُردو الفاظ کے کچھ دستیاب نمونوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالے میں ان تمام لغات کے برٹش میوزیم میں موجود نسخوں سے استفادہ کیا تھا۔ اس ضمن میں ایک مفید بحث ڈاکٹر نذیر احمد (علی گڑھ) نے شروع کی اور ایک مقالہ ''قدیم فارسی فرہنگوں میں اُردو عناصر'' لکھا۔ ڈاکٹر محمد باقر نے ان کے اس مقالے پر تنقید کرتے ہوئے اس موضوع پر تحقیقِ مزید سے روشنی ڈالی۔

لغات کے سلسلے کی ایک اہم تحقیقی کاوش سخاوت مرزا نے انجام دی۔ انھوں نے ایک مختصر مقالہ ''تحقیقاتِ الفاظِ ہندی غرائب اللغات'' لکھا، جو اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں اُردو کے بعض قدیم لغات اور لغت نگاروں کا ذکر ملتا ہے۔ اُردو کے اس پہلے لغت ''غرائب اللغات'' مولفہ عبدالواسع ہانسوی کے الفاظ کی تحقیق پر خان آرزو نے وقیع کام کیا تھا۔ اس لغت کو ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے عالمانہ مبسوط مقدمے اور تصحیح کے ساتھ مرتب کیا تھا، لیکن اس درمیانی عرصے میں کسی اور محقق نے اس لغت یا اس کے مولف پر نظر نہیں ڈالی۔ سخاوت مرزا کے اس مقالے سے معلوم ہوتا ہے کہ دکن کے بعض ادیبوں نے ''غرائب اللغات'' پر توجہ دی تھی اور اس بات کی تحقیق کی ہے کہ اس لغت میں دراصل اُردو الفاظ کون سے ہیں اور ہندی و فارسی کون سے ہیں۔

اُردو کے ابتدائی ناموں کی تحقیق پر بھی محققین نے خاطر خواہ توجہ دی ہے۔ تاریخی حوالوں میں اس کے جو مختلف نام ہندی، ہندوی، ہندوستانی، زبانِ ہندوستان، مورس، اُردوئے معلّٰی وغیرہ ملتے ہیں، ان کا حوالہ متعدد مصنفین کی تحریروں میں ملتا ہے۔ اوّلاً اس موضوع پر حافظ محمود شیرانی نے دادِ تحقیق دی تھی۔ بعد میں گراہم بیلی نے اپنی تصنیف "A History of Urdu Literature" میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی تصنیف ''اُردو زبان کا ارتقا'' میں اور پھر اسی موضوع پر ایک علاحدہ مقالہ لکھ کر اُردو کے مختلف ناموں کا تاریخی حوالوں سے جائزہ لیا۔ پروفیسر سیّد شبیر علی کاظمی کا مقالہ ''اُردو کے مختلف نام'' بھی اسی طرح کی تحقیقی کاوش ہے۔

پھر یہ مسئلہ بھی محققین کے پیشِ نظر رہا کہ لفظ ''اُردو'' بمعنی زبان پہلے پہل کس نے استعمال کیا۔ اس دریافت کا آغاز ڈاکٹر محمد باقر کے ایک مقالے ''اُردوئے قدیم کے متعلق چند تصریحات'' کو سمجھنا چاہیے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مراد شاہ لاہوری نے لفظ ''اُردو'' کو زبان کے معنوں میں سب سے پہلے استعمال کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے علاوہ ضمنی طور پر محمود شیرانی اور غلام دستگیر نامی بھی مراد شاہ لاہوری کے مؤید ہیں۔ لیکن بعد میں ڈاکٹر اے حلیم نے اصرار کیا کہ یہ لفظ سب سے پہلے میر عطا حسین تحسینؔ نے اپنی کتاب ''نوطرزِ مرصع'' میں استعمال کیا ہے، لیکن تحسینؔ نے اُردو کے بجائے ''زبان اُردوئے معلّٰی'' لکھا ہے۔ اس موضوع پر محمد اکرام چغتائی نے عمدہ تحقیق و دریافت سے کام لیا ہے۔ وہ اپنے تحقیقی مقالے ''اُردو بمعنی زبان کے متعلق نئی تحقیق'' میں ایسے تمام نظریات سے انحراف کرتے ہوئے اس سلسلے کا ایک نیا نام مائل دہلوی کا پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں لفظ اُردو، زبان کے معنوں میں سب سے پہلے میر محمدی مائل دہلوی (متوفی قبل ۱۲۲۱ھ) نے استعمال کیا۔ مائلؔ، قائم چاندپوری کے شاگرد تھے اور انھوں نے اپنا دیوان ۱۱۷۶ھ میں مرتب کیا تھا۔ اس دیوان میں ایک طویل قطعہ شامل ہے، جس میں چار مرتبہ لفظ ''اُردو'' زبان کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے ان چاروں مقامات کو مقالے میں نقل کیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی اس نئی تحقیق کے مطابق مائل دہلوی نے مراد شاہ لاہوری سے کم از کم ستائیس سال پہلے یہ لفظ استعمال کیا تھا۔

اُردو زبان کے متعلقہ پہلوؤں اور موضوعات پر مطالعہ و تحقیق کی وہ قدیم روایت جو اٹھارویں صدی کے اواخر سے شروع ہو کر محمد حسین آزاد تک پہنچی تھی اور جو بیسویں صدی میں حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری کے مخصوص اور فکر انگیز مطالعات کا موضوع بنی تھی،

ڈاکٹر محی الدین قادری، ڈاکٹر مسعود حسین خان اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے باوصف جدید لسانیات کے اصولوں اور نظریات اور ان علمائے لسانیات کے شعور سے فیض یاب ہوئی۔ آج اُردو زبان کے آغاز و ارتقا کے تمام تصورات اور نظریات ان علماء کے جدید تر مطالعے و شعور کے نتیجے میں جدید علمِ لسانیات کی کسوٹی پر پرکھے جا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے لیکن، آج کی ترقی یافتہ علمی دنیا میں لسانی تحقیق کے میدان میں جو مواد انگریزی، جرمنی، فرانسیسی اور روسی زبانوں میں جمع ہو گیا ہے، اس کے مقابلے میں اُردو میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ قطعی طور پر ہیچ ہے۔ جدید علمِ لسانیات کے اصولوں کے تحت خان آرزوؔ ہمارے پہلے عالم تھے، جنھوں نے فارسی اور سنسکرت کے قریبی تعلق کی طرف، سر ولیم جونز سے بھی پہلے اشارہ کیا تھا، لیکن وہ اس پر مفصل روشنی ڈالنے کی استعداد نہ رکھتے تھے۔ انشاء اللہ خان انشاؔء نے اُردو قواعد کے بعض اہم مسائل کو اہمیت دی اور اپنے عہد کے شہر دہلی کی بولیوں کے اختلافات کو اجاگر کرنے کی کوشش بھی کی، لیکن افسوس کہ یہ روایت ہمارے ہاں جاری نہ رہ سکی۔ چنانچہ قومی و ادبی اصلاح و ترقی کی تحریک کے آغاز سے پہلے سر سید احمد خان نے بجا طور پر یہ گلہ کیا تھا کہ اُردو میں کوئی مناسب قواعد موجود نہیں۔ ان کے دور میں محمد حسین آزادؔ بھی اس وجہ سے متاسف رہے کہ اُردو زبان، تہذیب کے دربار میں صفِ آخر میں کھڑی ہے اور اس کا ادب تنگ دامانی کا شکار ہے۔ گو اس سارے عرصے میں بعض ''مستشرقین'' نے، جن میں جان گلکرسٹ، گارساں دتاسی، میکس مولر، جان بیمز اور گریرسن وغیرہ شامل ہیں، مختلف صورتوں میں ہندوستانی زبانوں کا لسانی جائزہ لیا، جس میں ضمنی طور پر اُردو کے لسانی مطالعے کی کوششیں بھی شامل تھیں، لیکن اُردو کے اکابر و ماہرین نے اس باب میں خاطر خواہ جستجو نہ کی اور نہ لسانیات کے ان فوائد کی بابت سوچا جو مغرب کی علمی دنیا اس سے حاصل کر رہی ہے۔

اُردو اگرچہ سارے جنوبی ایشیا کی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ بڑا حلقۂ اثر رکھتی ہے اور یہ ہند آریائی علاقوں سے باہر، دراوڑی زبانوں کے علاقوں میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے، لیکن اس لحاظ سے بدقسمت زبان ہے کہ اس قدر وسعت، مقبولیت اور علمیت رکھنے کے باوجود اس پر علمی اعتبار سے قابلِ اطمینان کام ابھی تک نہیں ہوا۔ اُردو کا توضیحی مطالعہ، اُردو کی مختلف بولیوں کے جائزے اور دیگر لسانی موضوعات پر لسانی تحقیق، چند مضامین یا ایک آدھ کتاب سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس میں توضیحی لسانیات کے مطالعے کا آغاز ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ سے ہوا، ان کے بعد ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر گیان چند

وغیرہ نے لسانیات کے توضیحی اور تاریخی دونوں پہلوؤں پر لکھا، لیکن ان سب کوششوں کے باوجود اس کا مطالعہ ابتدائی منزل میں ہے اور اس کے تجزیاتی، توضیحی اور افادی پہلوؤں سے استفادے کی صورت ہمارے ہاں ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ مغرب کی زبانوں سے اس کا مقابلہ تو ایک طرف، یہ ابھی لسانیاتی تحقیق اور سائنٹی فک مطالعے کے لحاظ سے اپنے اطراف کی، بلکہ اپنے پڑوسی ملک (بھارت) کی دیگر زبانوں کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی، جہاں توضیحی لسانیات کے مطالعے کا آغاز ۱۹۵۴ء سے ہو چکا ہے، اور جہاں بلا مبالغہ اُردو اور ہندی میں لسانیاتی کتابوں کی تصنیف کا تقابلی تناسب ایک اور پچاس کا ہے۔

آج کے دور میں، جب کہ لسانیات نے زبان کے تاریخی جائزوں کی سرحدوں سے باہر نکل کر ریاضی اور سائنس کی اعلیٰ منزلوں تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ کسی زبان کے مطالعے میں ان منزلوں تک پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ زبان علمی وقار اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی حیثیت مستحکم کر رہی ہے۔ آج علوم کی بے پناہ ترقی کے دور میں زبانیں اب اپنے مخصوص وقار اور دائروں میں محدود نہیں رہ سکتیں۔ تہذیبی انقلاب، لسانی تبدیلیوں اور صنعت و سائنس کی بے پناہ ترقی میں انھیں اپنے لیے جگہ متعین کرنا ہے۔ ماضی کی طرف نگاہ رکھنا ضروری سہی، لیکن زمانے کی رفتار کے پیشِ نظر مستقبل سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ زندہ رہنے کے لیے مستقبل کے تقاضوں کو قبول کرنا ہوگا۔ ہم نے اُردو کے آغاز کے نظریوں اور سرگزشتِ الفاظ جیسے موضوعات کو سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ اُردو زبان و ادب کے اعلیٰ تعلیمی نصاب میں بھی اس سے زیادہ اگر کچھ رکھا بھی گیا ہے تو فقط نمائش کے لیے۔ ہمارے لیے اس کے مطالعے اور اس کی اہمیت و افادیت کی طرف توجہ صرف علمی لحاظ سے ہی ضروری نہیں بلکہ قومی نقطۂ نظر سے بھی اہم ہے۔ اس کے مطالعے سے انسانی گروہوں کی یکسانیت اور مشترکہ خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے اور لسانی ہم آہنگی بھی اس سے اجاگر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کے توسط سے انسانی گروہوں کے درمیان مطابقت، یکسانیت اور ہم آہنگی کے جذبات عام ہوتے ہیں اور اس طرح باہمی اخوت پیدا ہوتی ہے۔

زبان اور اس کے آغاز و ارتقاء پر محققین اور ماہرینِ زبان و لسانیات کی کوششیں دراصل انفرادی دل چسپی کے کام ہیں، جن کا تعلق ماضی یا ماضیِ قریب سے رہا ہے۔ آج ہمارے قدیم اور روایتی و تاریخی علمِ زبان نے جدید علوم اور ان کی تحقیقات کے زیرِ اثر اور خاص طور پر جدید علمِ لسانیات کے فروغ کے حالیہ ماحول میں خود کو توضیحی لسانیات اور اس کی مختلف شاخوں میں ضم کر لیا ہے۔ اس لیے

آج ہم زبان کے تعلّق سے کوئی مطالعہ جدید علمِ لسانیات سے رجوع کیے بغیر انجام نہیں دے سکتے۔ اس لیے اب ہمارے لیے یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ ہم جدید علوم اور جدید علمِ لسانیات کی روشنی میں اپنے موضوعات کا انتخاب کریں اور اُردو زبان کے آغاز و ارتقا کو اس کے مزاج اور اس کی خصوصیات کو نئے سرے سے جانچیں اور پرکھیں۔ چنانچہ زبان کے تعلّق سے مطالعے و تحقیق میں ضرورت اب اس بات کی ہے کہ:

۱) ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جائے، جو زبان کے صوتی تجزیے پر مبنی ہوں۔ کیوں کہ زبان کی بنیاد ہی صوت یا آواز ہے اور صوتی خصوصیات کے مطالعے کے بغیر نہ ہم آگے بڑھ سکتے ہیں نہ زبان کے متعلق پہلوؤں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ صوتی تجزیے سے زبان کا اصل مزاج سامنے آئے گا اور حرف و صوت کا رشتہ واضح ہوگا۔

۲) صوتی مطالعے کے بعد قواعد کی جدید خطوط پر ترتیب ضروری ہے۔ قواعد کے ضمن میں زبان کا صرفی و نحوی مطالعہ لازمی ہے۔ اس کے توسط سے زبان کا وظیفہ و عمل اپنی منطقی توجیہات کے ساتھ واضح ہوگا۔

۳) پھر اُردو کا رشتہ دیگر زبانوں سے استوار کرنے اور علاقائی بولیوں کے مطالعے سے باہمی اثرات نمایاں کرنا بھی ضروری ہے۔ اس طرح زبان اپنے علاقائی، تہذیبی اور معاشرتی تناظر میں پوری طرح قابلِ فہم ہو سکے گی۔ اس ضمن میں مثلاً کرخنداری اور اُردو اور دکنی اور اُردو کے مطالعوں کی مثالیں، جنھیں علی الترتیب گوپی چند نارنگ اور محی الدین قادری زورؔ نے انجام دیا، سامنے رکھی جا سکتی ہیں۔

۴) بولیوں اور زبان کے علاقائی اور معاشرتی مطالعوں میں مختلف انسانی گروہوں، طبقوں اور پیشوں کو بھی حوالہ بنایا جا سکتا ہے۔

ان موضوعات کی مثالوں کو سامنے رکھ کر ہم ماضی اور مستقبل دونوں کے تقاضوں کے تحت لسانی مطالعہ اور تحقیق کے در وا کر سکتے ہیں۔ وہ تمام عنوانات اور موضوعات جو ہمارے ماہرینِ زبان کے پیشِ نظر رہے، جدید علمِ لسانیات کے اصولوں کے تحت دوبارہ ہمارا موضوع بن سکتے ہیں۔ اور ساتھ ہی جدید علمِ لسانیات کا شعور حاصل کر کے ہم اپنے معاشرتی اور قومی تقاضوں کے تحت زبان کے مطالعے کو وسعت بھی دے سکتے ہیں اور اس سے قومی و معاشرتی فوائد بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

فہرستِ مآخذ

۱۔ آرزو، سراج الدین علی خاں: ''نوادرالالفاظ'' مرتبہ: ڈاکٹر سیّد عبداللہ، کراچی، انجمنِ ترقی اُردو، ۱۹۵۱ء۔

۲۔ آزاد، محمد حسین: ''آبِ حیات'' مرتبہ: ابرار عبدالسلام، ملتان، شعبۂ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۶ء۔

۳۔ امن، میر: ''باغ و بہار''، مرتبہ: رشید حسن خاں، دہلی، انجمن ترقی اُردو، ۱۹۹۲ء۔

۴۔ بخاری، سہیل، ڈاکٹر: ''اُردو کی زبان''، کراچی، فضلی سنز، ۱۹۹۷ء۔

۵۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر: ''تاریخِ ادب اُردو''، جلد اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء۔

۶۔ خاں، مسعود حسین: ''مقدمہ تاریخ زبانِ اُردو''، کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۶ء۔

۷۔ خاں، غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر: ''اُردو میں قرآن اور حدیث کے محاورات''، اسلام آباد، ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، ۱۹۸۰ء۔

۸۔ خاں، غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر: ''فارسی پر اُردو کا اثر''، طبع دوّم، کراچی، عبدالرحمٰن خاں، ۱۹۶۰ء۔

۹۔ دل، انور شبنم: "An out line of Urdu Sentence Structure"، لاہور، ۱۹۶۴ء۔

۱۰۔ راشدی، حسام الدین: ''اُردو کا مولد سندھ''، مشمولہ سہ ماہی ''اُردو''، کراچی، اپریل ۱۹۵۱ء۔

۱۱۔ زور، محی الدین قادری: ''ہندوستانی لسانیات''، لاہور، مکتبۂ معین الادب، ۱۹۶۱ء۔

۱۲۔ سلیمان ندوی، سیّد: ''نقوشِ سلیمانی''، کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۷ء۔

۱۳۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر: ''اُردو زبان کا ارتقا''، ڈھاکہ، گہوارۂ ادب، ۱۹۶۵ء

۱۴۔ صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر: ''اُردو کی ادبی تاریخ'' تاریخ کا خاکہ، کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۴ء

۱۵۔ عقیل، معین الدین: ''پاکستان میں اُردو تحقیق، موضوعات اور معیار''، کراچی، انجمن ترقی اُردو، ۱۹۸۷ء۔

۱۶۔ عین الحق، فرید کوٹی: ''اُردو زبان کی قدیم تاریخ''، لاہور، ارسلان پبلیکیشنز، ۱۹۷۲ء۔

۱۷۔ کاظمی، شبیر علی: ''پراچین اُردو''، کراچی، ۱۹۷۹ء۔

۱۸۔ کیفی، برجموہن دتاتریا: ''کیفیہ''، لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۰ء۔

۱۹۔ گیان چند جین: ''لسانی مطالعے''، دہلی، نیشنل بک ٹرسٹ، ۱۹۷۳ء۔

۲۰۔ گیانی، عبداللہ: ''گوگرنتھ اور اُردو''، لاہور، مرکزی اُردو بورڈ، ۱۹۶۶ء۔

۲۱۔ محمود شیرانی، حافظ: ''پنجاب میں اُردو'' مرتبہ محمد اکرام چغتائی، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۵ء۔

۲۲۔ نذیر احمد: ''فارسی کی قدیم فرہنگوں میں ہندوستانی عنصر''
مشمولہ ''ارمغان مالک رام''، جلد دوم، دہلی، ''مجلسِ ارمغانِ مالک''، ۱۹۷۱ء۔

۲۳۔ ہاشمی، نصیر الدین: ''دکن میں اُردو''، حیدرآباد دکن، مکتبۂ ابراہیمیہ، ۱۹۳۶ء۔

Common elements in the structure of Turkish & Urdu, University Studies Karachi, August 1996

ڈاکٹر عطش درانی

تحقیقی خواص میں اعتباریت یا ساکھ؟

دورِ جدید میں تحقیق ایک الگ مضمون، ڈسپلن یا موضوع بن چکا ہے جس میں حاصلات سے کہیں زیادہ طریقِ کار پر زور دیا جاتا ہے۔ خواہ اس کی بنیاد میں کوئی فلسفہ کارفرما ہو یا نہ ہو۔ ادبی ولسانی تحقیق میں اسی طریقِ کار کی رسمیات (Formalities) پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

تلاش، تفتیش اور تحقیق ایک پہلو سے مترادفات کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن جب ہم تحقیقی میدان یا ڈسپلن کی بات کرتے ہیں تو تلاش اور تفتیش اس کے ذیلی اجزا قرار پاتے ہیں۔ تحقیق کا مقصد محض صداقت کی تلاش اور حقائق کی تفتیش یا بازیافت نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، یہ ایک نہایت ذمے داری، دقتِ نظری اور ریاضت کا کام ہے۔ بعض کے نزدیک تحقیق سوال کرنے اور اس کا معروضی جواب پانے کا نام ہے۔ بعض کے نزدیک متغیرات (Variables) اور کارکردگی کی پیمائش میں تعلق معلوم کرنے کو تحقیق کہتے ہیں۔ بعض اس کے طریقِ کار اور بعض حاصلات کو تحقیق کا نام دیتے ہیں۔ جب کہ تحقیق بعض مفروضات (Assumptions) کے ساتھ تقابل کرتے ہوئے فرضیات (Hypotheses) کے حقائق دریافت کرنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ منظّم، معروضی، مدلّل اور کُلّی ہوتی ہے۔ یعنی تحقیق ایک ایسا طریقِ کار ہے جو (1) منظّم (Organized)، (2) معروضی (Objective)، (3) مدلّل (Rational) اور (4) کُلّی (Holistic) طور پر انجام پاتا ہے۔

تحقیق، صداقت کی معروضی تلاش ہے اور معروضی صداقت صرف وہی نہیں ہوتی جو کوئی ایک شخص موضوعی طور پر جانتا ہو بلکہ ضروری ہے کہ دوسرے بھی اسی کی مانند اس کیفیت کو معروضی طور ہی پر جان سکیں۔ زبان وادب کے شعبے میں تحقیق کھرے اور کھوٹے کی چھان بین یا تصدیق کرنے کو کہا گیا ہے، لیکن یہ تلاش اور تصدیق ایک باضابطہ طریقِ کار یا رسمیات کے مطابق انجام پاتی ہے۔ یہ طریقِ کار منطقی اور معروضی ہوتا ہے۔ ایسا نہیں جیسا کہ اب تک ادبی شعبے میں سمجھا جاتا رہا ہے۔

جدید تحقیق کو عام طور پر فن، تکنیک یا اصول کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے۔ علم کے لحاظ سے یہ ایک سائنس ہے کیوں کہ اس میں سائنسی طریقِ کار استعمال ہوتا ہے تاہم جہاں تک اس کے فنی طریقِ کار کا تعلق ہے، یہ ایک تکنیک ہے جو چند بنیادی تحقیقی اصولوں پر مبنی ہے اور اپنی پیشکش یا اسلوب کے لحاظ سے یہ ایک فن ہے، کیوں کہ استدلال اور بیان، فن کارانہ چابک دستی کا تقاضا کرتے ہیں۔

زینا اولیری (Zina O'Leary) نے حال (2004ء) ہی میں تحقیق کاری پر اپنی کتاب The Essential Guide to Doing Research (2004) کو اس نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے کہ تحقیق ایک فکری شغل (Thihking game) کے ساتھ ساتھ کل ذہنی سرگرمی (Whole-brain activity) ہے۔ اس کے خیال میں تحقیق کار کو بنیادی طور پر تحقیقی تخلیقیت سے کام لینا ہوتا ہے جس میں تجزیہ اور فیصلہ ایک مسلسل عمل کی صورت میں ہوتا ہے اور ذہن کو کلّی طور پر اس میں مصروفِ عمل رکھنا ہوتا ہے۔

ادبی و لسانی تحقیق کے حوالے سے تحقیق، زبان و ادب میں موجود مواد کو ازسرِ نو مرتب کرتی، نئی معلومات کی روشنی میں نئے نظریات وضع کرتی اور نئے نتائج سے زبان و ادب کی نئی تاریخ مرتب کرتی ہے۔ اس کا بیش تر مواد ماضی اور تاریخ میں ملتا ہے اور حال پر کام نیز تجربہ بہت کم پایا جاتا ہے۔ گویا زبان و ادب کی تحقیق، تاریخی اور آثاریاتی زیادہ ہوتی ہے اور جائزہ کاری یا بیانیہ اور تجرباتی کم ہوتی ہے۔ اگرچہ سائنسی طریقِ کار دونوں کے لیے درکار ہوتا ہے۔ تحقیق نہایت غیر جانب داری سے انجام دیا جانے والا عمل ہے جس میں ذاتی رائے اور پسند و ناپسند کو دخل حاصل نہیں۔ اسلام میں اسے ''عدل'' اور تکنیک میں اسے ''معروضیت'' (Objectivity) کا نام دیا گیا ہے۔

تجرباتی اور آلاتی تحقیق میں معروضیت یا غیر جانب داری بہ آسانی سمجھ میں آجاتی ہے لیکن دستاویزی تحقیق میں معروضیت کی تلاش اور اطلاق بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ادبی فن پارے کا حسن یا زبان دان اور ادیب کی سماجی حیثیت، رجحانات اور حدود ان نازک سی معنوی تعبیرات (Connotations) میں موجود ہوتے ہیں، جنھیں معروضی گرفت میں لانا دشوار ہوتا ہے۔ فنی کیفیات کا تجزیہ کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ محض تنقیدی اصول برت کر جو اکثر خود بھی معروضی نہیں ہوتے، معروضی نتائج نکالنا مشکل ہوتا ہے۔ معروضیت میں کوائف یا معلومات کا درست ہونا صحت کہلاتا ہے۔ کوائف اپنے متن، معیار، عصر، تصورات وغیرہ کے لحاظ سے جائز اور موزوں ہوں تو اسے ''جواز'' کہا جاتا ہے اور کوائف اپنے نتائج کے لحاظ سے بار بار ایک سے ہوں تو اسے ''وثوق'' یا ''اعتباریت'' کہا جاتا ہے۔

جدید تحقیق میں معروضیت کا ایک ہی مفہوم ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص یہی تحقیق انجام دے تو اس کے نتائج بھی وہی نکلیں جو پہلے شخص نے برآمد کیے ہیں۔ لسانی و ادبی تحقیق میں بعض ایسے متبدل یا تبدیل ہونے والے عناصر ایسے متغیرات (Variables) ہوتے ہیں جو تحقیقی نتائج پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ وثوق کی منزل تک پہنچنے کے لیے ان متغیرات پر قابو پانا بہت ضروری ہوتا ہے۔ تاریخی تحقیق میں ایک بڑا متغیرہ ''وقت'' یا ''زمانہ'' (Time) ہے جس کی تحدید (Delimitation) عموماً نہیں ہو پاتی۔ یعنی اس متغیرے کے اثرات اور امکانات پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔

جدید سائنسی تحقیق میں تو معروضیت کے پیمانے مقرر کیے جا چکے ہیں، چنانچہ وہاں تحقیق ڈیزائن اور پیش کش کے خاکے طے شدہ ہیں۔ ادبی و لسانی تحقیق میں معروضیت قائم کرنے کے لیے ہر قدم پر ''عدل'' کی شرط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب پیمائشی رائے، مقداری انداز میں دی جا رہی ہو تو نہ صرف یہ کہ ذاتی تعصب، پسند و ناپسند اس میں شامل نہ ہو بلکہ مقداری پیمانے اور اسکیل مقرر کر لیے جائیں نیز اپنی ان اصطلاحوں کے مفاہیم متعین کر کے پہلے سے بیان کر دیے جائیں، جن میں کوئی رائے دی جا رہی ہو۔ معروضیت کے بغیر کوئی تحقیق، تحقیق نہیں کہلا سکتی۔ اعتبار، اعتماد، موزونیت، وثوق، جواز، صحت اور پیمانے یہ سب الفاظ معروضیت کے نکات قرار پاتے ہیں۔

اصولِ تحقیق کا اپنا بھی ایک تنقیدی پہلو ہے جس سے اس کی اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ یہ تنقیدی اصول ظاہر کرتے ہیں کہ تحقیق کار کو کوئی شے گمراہ نہیں کر سکتی اور نہ ہی وہ کوائف اور معلومات کو مسخ کرتا ہے بلکہ اس کے طریقوں اور نتائج کی پڑتال ہر کوئی کر سکتا ہے اور انھیں ہر وقت چیلنج کر سکتا ہے۔ یہ خصوصیت اس کی اسی معروضیت کی بنا پر پیدا ہوتی ہے۔

موجودہ ادبی لسانی مقالات کی ایک بڑی خامی ان کی عدم معروضیت ہے۔ یعنی وثوق، جواز، موزونیت اور صحت کے حوالے سے کسی مخصوص ڈیزائن کی پیروی نہ کرنا بڑے سے بڑے تحقیقی کاموں کو پایۂ استناد سے گرا دیتا ہے۔

جدید تحقیق ایک سائنسی طریقِ کار ہے، جو مختلف مظاہر کے درمیان ربط تلاش کرتا اور اس کی معروضی تشریح کرتا ہے۔ اس کا آغاز سائنسی علوم سے ہوا۔ پھر نفسیات کے مضمون میں تھارن ڈائیک سے پیاژے تک بہت سے نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ بعد ازاں علم التعلیم کے ماہرین نے انھیں آگے بڑھایا۔ وان ڈیلن، گڈ اور بیسٹ کی کتابیں حوالہ بنیں۔ پھر عمرانی اور سماجی علوم میں

یہ اصول آزمائے جانے لگے۔ یوں سماجی علوم کے واسطے سے جدید تحقیق، زبان و ادب کے میدان میں داخل ہوئی ہے۔ یہ بجا کہ ادبی حقائق تلاش کرنا بہت مشکل کام ہے، لیکن یہ تو تحقیق کی ابتدا ہے منزل نہیں، ان سے کسی نقطۂ نظر یا اصول و نظریات وضع کرنا محض فرضیے کی حد تک چلے آنا ہے۔ کسی فرضیے پر صرف ایک بار تحقیق کے نتائج کو ہم کسی صورت میں آخری اور حتمی قرار نہیں دے سکتے۔ اس کے علاوہ اس کی صحت بھی مشکوک رہتی ہے، لیکن جب ایک ہی فرضیے کو مختلف جگہوں پر مختلف لوگ آزماتے ہیں اور نتائج میں یکسانیت پاتے ہیں تو نتائج میں وثوق یا اعتمادیت آجاتی ہے۔ ہم مکمل اعتماد سے یہ دعوا کر سکتے ہیں کہ فرضیہ بالکل درست ہے اور اس کے نتائج کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ سائنسی تحقیق میں اس معتبری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کوئی بھی فرضیہ وثوق حاصل کرنے کے بعد نظریہ بن جاتا ہے۔ اگر یہ نظریہ زمان و مکان کے لحاظ سے درست ثابت ہو جائے تو قانون بن جاتا ہے جیسے کششِ ثقل کا قانون، لیکن ہر نظریہ قانون نہیں بن سکتا۔ بہر حال سائنسی تحقیق کی جان وثوق میں ہے۔ ادبی و لسانی تحقیق میں عام طور پر تنقیدی ادّعا (Dogma) سے کام لیا جاتا ہے، لیکن تحقیقی وثوق تک پہنچنے کے لیے بہت محنت اور کارگزاری درکار ہوتی ہے۔ جس کی طرف ادبی و لسانی تحقیق کو ابھی پہلا قدم اٹھانا ہے۔

جدید تحقیق میں دو امور (۱) تصورات (۲) متغیرات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ زبان و ادب کی تحقیقی روایت میں ابھی تک محض نظریات کا دور دورہ تھا۔ اب تصورات اور متغیرات کے حوالے سے تحقیق انجام دینے کا آغاز ہوا ہے۔ اب شاید زبان و ادب کی تحقیق بھی اس ڈسپلن میں اپنا کوئی مقام تلاش کر سکے گی، جس میں تصورات اور متغیرات کے باہم تعلّق پر بحث ہو سکے۔

اصولِ تحقیق کی روشنی میں اُردو ادب کی تاریخ میں تین تحقیقی مکاتبِ فکر یا دبستان (Schools of thought) وجود میں آئے ہیں۔ جو عربی اور فارسی روایت کے بعد ''علم التعلیم''، ''نفسیات'' اور ''سائنس'' کے تحقیقی اصولوں کے اثرات سے پیدا ہوئے ہیں۔

اصولِ تحقیق کے لحاظ سے پہلا تحقیقی دبستان سرسید سے شروع ہوتا ہے، آزادؔ، حالیؔ و شبلیؔ جیسے مشاہیر اُن کے ساتھیوں میں سے تھے۔ رشید حسن خان نے اسے اُردو کا مروّج دبستان قرار دیا ہے۔ جس میں روایات جوں کی توں قبول کر لینا اور تحقیق کا مقصد محض حقائق کی بازیافت قرار دینا ہے۔ اس میں ''بہر کیف و بہر حال اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں'' کوائف جمع کرنے کا عمل انجام دیا جاتا ہے۔ تحقیقی بصیرت اور درک اس کا بھی لازمہ ہے۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر وحید قریشی، مسعود حسن خان اور

ڈاکٹر گیان چند وغیرہ اسی دبستان سے تعلق رکھنے والے سیکڑوں محققین میں سے ہیں۔ یہ تحقیق، طریقوں کو ''اصول'' قرار دیتی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کی کتاب ''تحقیق کا فن'' اس ترتیب وتدوین پر مبنی تحقیق کے لیے ایک عمدہ بلکہ بہترین کتاب ہے۔ اس مکتبِ فکر کو ''تالیفی دبستان'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔

دوسرا مکتبِ فکر یا دبستان جمع شدہ کوائف کو اصل مآخذوں سے حاصل کر کے تشریح وتوضیح کرنا اور کوئی نظریہ قائم کرنا تحقیق کا مقصد قرار دیتا ہے۔ اس کے لیے تنقیدی اصولوں کا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا ڈاکٹر لائٹنر سے ہوتی ہے۔ حافظ محمود شیرانی اس کے معلمِ اوّل ہیں۔ اُردو ادب کی تاریخ میں اس کی پیروی قاضی عبدالودود کے سوا ابھی تک کوئی نہیں کر سکا۔ کسی حد تک مشفق خواجہ، خلیل الرحمان داؤدی اور رشید حسن خان کو اس پر عمل پیرا دیکھا۔ یہ دبستان تحقیقی اصولوں کو فن قرار دیتا ہے۔ اسے ''انتقادی دبستان'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔

تیسرا مکتبِ فکر یا رجحان ''جدید سائنسی تحقیق'' کی اساس پر تحقیقی ڈیزائن اور کسی مسئلے پر فرضیوں کی جانچ پرکھ کرنا اہم سمجھتا ہے۔ اس میں مقداری اور معیاری دونوں تجزیے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس کا سرسری ساذکر شاید علم التعلیم کی تحقیقی کتابوں کی بناء پر کیا ہے اور اُردو ادب سے مثالیں دی ہیں لیکن ابھی تک کسی بڑے محقق کی مثال انھیں نہیں مل سکی۔ شاید اُردو ادب کی تحقیق میں اس کا چلن عام نہیں ہو سکا۔ البتہ نچلی سطح پر اس کا احساس رہا۔ ''مطالعۂ احوال''، ''نفسی تجزیے'' اور ''عاداتِ مطالعہ'' جیسے موضوع اس میں استعمال ہوئے لیکن بیانیہ تقابلی جائزے جو اس طریق کی اساس ہیں، بہت کم دیکھنے میں آئے۔ ''مقتدرہ قومی زبان'' کے سیمینار ''اصولِ تحقیق'' منعقدہ ۲۵ تا ۲۷ مارچ ۱۹۸۶ء میں یہ احساس پوری طرح سامنے نہیں آیا، البتہ جدید تحقیق کی طرف اشارے اس کے بعض مباحث و مقالات میں ملتے ہیں لیکن عام طور پر ادبی محققین اس سے نابلد اور کوسوں دور نظر آتے ہیں۔ پشاور یونیورسٹی، شعبۂ اُردو کے سیمینار ''ادبی تحقیق'' ۱۰ تا ۱۲ اگست ۲۰۰۲ء باڑہ گلی میں ایسی ہی رسمیات (Formalities) کی طرف خصوصی توجہ مبذول ہوئی اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد شعبۂ ''پاکستانی زبانیں'' سے اس پہلو پر دسمبر ۲۰۰۴ء میں ''اصولِ تحقیق'' کا پہلا کورس پیش کیا گیا۔ اس مکتبِ فکر میں تحقیق کو ''کلّی رسمیات'' قرار دیا جاتا ہے۔ اس دبستان کو (اگر یہ ہے) ''تکنیکی دبستان'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔

ادبیات اور لسانیات میں سائنسی طریقۂ تحقیق کا استعمال اس قسم کی تحقیق کو دنیائے علم، تحقیق میں وثوق اور جواز کے جس مرتبے پر فائز کردے گا، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ہر قسم کے نامساعد

حالات اور جامد تعصبات کے باوصف طرزِ کہن پر اڑے رہنا، غیر سائنسی رویہ ٹھہرتا ہے اور ادبی و لسانی تحقیق کو فرضیوں کی تشکیل اور منطقی استدلال کی دہلیز پر لانے کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ اس رویے سے جس قدر جلد چھٹکارا پا لیا جائے، اتنا ہی جلد ادبی و لسانی تحقیق اپنا مقام و مرتبہ پا سکے گی، جو فی الحال تحقیقی ڈسپلن کے اندر، اسے حاصل نہیں۔

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں ادبی و لسانی تحقیق کو جدید تحقیق کا ڈسپلن بننے کی راہ میں جو مسائل (Issues) حائل ہیں، ان میں سرِ فہرست جامعات میں ان زبانوں کے شعبوں کا جدید تحقیق کے اصولوں کے ساتھ معاندانہ رویہ ہے۔ اُردو کی ادبی تحقیق پر پہلے دو تحقیقی دبستانوں کا اثر زیادہ ہے۔ پہلا دبستان جسے ہم سرسید کی دین سمجھتے ہیں، بہر حال ''اپنے نقطۂ نظر کی تائید'' اور محض ''معلومات کی تلاش'' کو تحقیق سمجھتا ہے، فراواں ہے۔ دوسرا دبستان جسے ڈاکٹر لائنٹر کی روایت قرار دینا چاہیے اور جو ''اصل ماخذ و مصادر'' کی تشریح و توضیح کو اپنا مقصود ٹھہراتا ہے محدود ہے۔ جب کہ تیسرا نقطۂ نظر جسے ہم پیش کرنے کی سعیِ نامشکور میں مصروف ہیں، جدید تحقیقی اصولوں پر قائم ہوتا ہے۔ ان جدید تحقیقی اصولوں کو کبھی ''ڈھکوسلے'' کہا گیا ہے اور کبھی شعبۂ ''علم التعلیم'' کے لوگوں کا مداری پن قرار دیا گیا، جہاں گڈ، بیسٹ، تھارن ڈائیک وغیرہ کے حوالے موجود ہیں یا جو ''تکنیکِ تحقیق'' کے باقاعدہ عمیق و دقیق کورسوں کی بناء پر ادب اور زبان کے شعبوں کی تحقیق کو تحقیق تصور ہی نہیں کرتے۔ ایک طرح سے دونوں شعبوں کے اہلِ تحقیق اپنے اپنے ساز و آواز میں گم اور مست ہیں۔ کبھی کبھار کوئی مرتب و مصنف انھیں جھنجھوڑتا ہے تو اسے محض ان کی تالیفی و تصنیفی ترنگ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ اب یہ رویہ بہت حد تک دم توڑ چکا ہے اور اسلام آباد سے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبہ ''پاکستانی زبانیں و ادب'' کی طرف سے جدید ''اصولِ تحقیق'' پر پہلا کورس پیش بھی کر دیا گیا ہے لیکن ابھی اُردو اور پاکستانی زبانوں کے دوسرے شعبوں کو اپنے روایتی طریقۂ تحقیق کو خیر باد کہنے میں کچھ وقت لگے گا۔

جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے، فرضیہ عام طور پر متغیرات کا آپس میں تعلق ظاہر کرتا ہے اور تحقیق میں اسی تعلق کو درست یا غلط ثابت کرنا ہمارا اولین مقصد ہوتا ہے۔ متغیرات دو قسم کے ہوتے ہیں، جنھیں وصفی متغیرہ اور مقداری متغیرہ کہا جاتا ہے۔ وصفی متغیرہ کسی چیز کی کیفیت یا صفت کو ظاہر کرتا ہے، مثلاً خوب صورتی، اچھائی، ذہانت وغیرہ۔ ادبی تنقید اور تحقیق میں یہ متغیرہ عام طور پر موجود ہوتا ہے۔ اس متغیرے کو صحت اور پیمائش کے ساتھ پیش کرنا تحقیق کی اہم خاصیت ہے۔

مقداری متغیرہ کسی چیز یا واقعے کی مقدار کو ظاہر کرتا ہے، مثلاً طلبہ کے کسی مضمون میں حاصل کردہ نمبر، یونیورسٹی میں مطالعے کے عادی طلبہ کی تعداد وغیرہ۔ وصفی نوعیت کے متغیرے یا واقعات کی پیائش میں محققین کو دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انھیں مُروّجہ پیمانوں کی مدد سے ناپا تولا جانا اور ان سے کسی نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ماہرین ایسے وصفی نوعیت کے واقعات کو مقداری متغیرات میں تبدیل کر کے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ اس قسم کے اعداد و شمار کو شماریاتی مواد کہا جاتا ہے۔ اس مواد پر تحقیق کے طریقے استعمال کیے جاتے ہیں اور نتائج حاصل کیے جاتے ہیں۔ لسانی تحقیق میں شماریات کی مدد بھی درکار ہوتی ہے۔

اگر تحقیق کو نئے علم کی تخلیق کا ذریعہ کہا جاتا ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس نوعیت کی تحقیق کس قدر ساکھ اور عمدگی رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تحقیق کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ بعض مسلّمات اور عقائد کو رد کر سکے۔ تحقیقی دنیا سے باہر ''ساکھ'' کا مطلب ہے: ''قابلِ یقین، قابلِ قبول، ممکن، حقیقی اور مسلّمہ ہونا''۔ تحقیق کی دنیا میں ساکھ کے اختصاصی مطالب متعین ہوتے ہیں جن کا ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں مثلاً عمومیت معتبری، جواز، وثوق، صحت، استناد، غیر جانب داری وغیرہ۔ عمدہ تحقیق وہی تحقیق کہلائے گی جو ان معیارات پر پوری اترتی ہو۔ ہم اسے کسی بھی فلسفے (اثباتیت یا مابعد اثباتیت) کے نقطۂ نظر سے دیکھیں، یہ اپنا اعتبار اور ساکھ ہم پر قائم کرے۔ زینا اولیری نے ساکھ کے اس تجزیے کے اہم عناصر کو ان دونوں فلسفوں کی روشنی میں پانچ سوالات کے جوابات طے کیے ہیں، جو چوکھٹے میں درج ہیں۔

اثباتیت	مابعد اثباتیت
1۔ کیا موضوعیت کو سمیٹ لیا گیا ہے؟ معروضیت: ایسے نتائج جو جذبات، ذاتی تعصّبات اور موضوعی عناصر سے پاک ہوں۔	غیر جانبداری: تعصّبات اور جانب داری سے بے نیاز، خواہ موضوعیت کو تسلیم کیا گیا ہو لیکن اثرات کا جائزہ شفاف طور پر لیا گیا ہو۔
2۔ کیا طریقِ کار کا تسلسل اور تواتر موجود ہے؟ وثوق: اعتبار یا معتبری طریقِ کار کے تسلسل اور متواتر عمل پذیر ہونے پر ہے تاکہ بار بار دہرانے پر ایک سے نتائج آئیں۔	انحصار پذیری: خواہ نتائج کا معتبر ہونا ممکن نہ ہو لیکن طریقِ کار منظم ہو، تحشیہ نگاری کے ساتھ ہو اور معروضیت کو محدود کر سکے۔

3۔کیا مسئلے کی روح کشید کر لی گئی ہے؟ جواز: صداقت پر انحصار ہو۔ نتائج کی صحت جانچی جا سکے اور کیا طریقِ کار، انداز اور تکنیک اس مسئلے کے لیے موزوں تھے؟	استناد: صداقت کی قدر سے وابستہ ہو خواہ متعدد صداقتیں سامنے آئیں تا کہ قدر کا استحسان ہو سکے۔
4۔کیا ماحصل کا اطلاق اس حوالے سے باہر ہو سکتا ہے؟ تعمیم: عمومیت یا فارمولا سازی ہو سکے، جس کا اس گروہ کے علاوہ عام امور پر بھی اطلاق ہو سکے۔	انتقال پذیری: ایک نمونے کے نتائج کو دوسرے نمونوں پر منتقل کیا جا سکے جو کسی اور انداز کے ہوں۔
5۔کیا تحقیق کی توثیق ہو سکتی ہے؟ دہرائی: اگر اس تحقیق کو کسی اور تناظر میں ایسے ہی حالات اور مواد پر آزمایا جائے تو ویسے ہی نتائج سامنے آئیں۔	تنقیح پذیری: تحقیقی تناظر کی اہمیت قبول ہو سکے تا کہ دوسرے بھی دیکھ لیں کہ تحقیق ان نتائج تک کس طرح سے پہنچی یعنی طریق کار کی شفافیت۔

اعتباریت مندرجہ ذیل سوال اٹھاتی ہے، جن کا جواب تحقیقی حاصلات سے حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے، تب ہی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ تحقیق کار نے کس حد تک واثق اور معتبر کام کیا ہے۔ اس کی انجام دادہ تحقیق کی ساکھ یا عمدگی کس تک ہے۔

۱۔ عنوان کتنا واضح اور مختصر ہے؟
۲۔ مسئلہ کس قدر واضح طور پر بیان کیا گیا ہے؟
۳۔ تحقیقی حدود اور تحدید کہاں تک بیان کی گئی اور کیا یہ مسئلے کے مطابق ہیں؟
۴۔ کیا مفروضے واضح اور قابل فہم ہیں؟
۵۔ کیا تحقیقی اصطلاحات کی صراحت کر دی گئی ہے؟
۶۔ کیا فرضیے یا تحقیقی سوالات واضح اور جانچ کے قابل ہیں؟
۷۔ کیا فرضیے متعلقہ ادبیات کے مطالعے سے وضع ہوئے ہیں؟
۸۔ کیا سابقہ تحقیق و ادبیات کا جائزہ مختصراً اور موثر طور پر لیا گیا ہے؟
۹۔ کیا تحقیق کا طریقۂ کار بیان کیا گیا ہے اور کہیں اس سے انحراف نہیں ہوا؟
۱۰۔ کیا تحقیقی آبادی اور نمونہ کاری کو واضح کیا گیا ہے؟

۱۱۔ کیا اثر انداز ہونے والے متغیرات کو قابو میں رکھا گیا ہے؟
۱۲۔ کیا کوائف حاصل کرنے کا طریقہ واضح ہے؟
۱۳۔ کیا کوائف یا معلومات واثق اور معتبر ہیں؟
۱۴۔ کیا کوائف یا معلومات کا مؤثر تجزیہ کیا گیا ہے؟
۱۵۔ کیا مقالے کے جملے سادہ اور تحقیقی زبان میں ہیں اور مفہوم واضح کرتے ہیں؟
۱۶۔ کیا غیر ضروری جملوں سے گریز موجود ہے؟
۱۷۔ رموزِ اوقاف کا کس قدر خیال رکھا گیا ہے؟
۱۸۔ کیا حوالے صحیح طریقے سے دیے گئے ہیں اور کیا ان میں یکسانیت موجود ہے؟
۱۹۔ کیا اقتباسات کم سے کم اور مختصر دیے گئے ہیں اور زیادہ تر بات اپنے الفاظ میں کی گئی ہے؟
۲۰۔ کیا عبارت واضح اور مقالہ نگار وہی لکھ رہا ہے جو وہ کہنا چاہتا ہے؟
۲۱۔ کیا غیر شخصی اور معروضی انداز اختیار کیا گیا ہے؟
۲۲۔ کیا جداول، خاکے، اعداد و شمار اور ضمیمے ضروری ہیں اور درست طریقے سے دیے گئے ہیں؟
۲۳۔ کیا مقالہ نگار نے اپنی تحقیق کے بنیادی نکتے کو ہمہ وقت سامنے رکھا ہے؟
۲۴۔ کتابیات کس حد تک موزوں اور یکساں طریقے پر دی گئی ہے۔ کیا غیر ضروری اندراجات تو شامل نہیں؟
۲۵۔ کیا نتائج اور سفارشات تحقیق پر مبنی ہیں، غیر ضروری اور اضافی طور پر تو نہیں دیے گئے؟
۲۶۔ کیا ضخامت موضوع کے مطابق موزوں ہے؟
۲۷۔ ٹائپ اور کتابت کی غلطیاں کس حد تک موجود ہیں؟
۲۸۔ کیا غیر ضروری مواد تو شامل نہیں کیا گیا؟
۲۹۔ کہیں محض تنقیدی جملوں کا سہارا لے کر تو تحقیق انجام نہیں دی گئی؟
۳۰۔ کیا ضروری ماخذوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ کیا ثانوی ماخذوں سے گریز اور ماخذوں پر تنقید موجود ہے؟

ان نکات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمارا مجموعی جواب جو کچھ بھی ہوگا وہ تحقیقی معیار، اعتبار اور ساکھ کا تعین کر سکے گا۔

ڈاکٹر تنظیم الفردوس

مولانا احمد رضا خاں

کی نعتیہ شاعری میں ہیئت کے تنوع کی ابتدائی روایت

نعت کا مفہوم اگر چہ بحرِ بے کراں ہے لیکن دنیا کی اہم ترین زبانوں، بشمول عربی، فارسی، ہندی، اُردو، پنجابی، پشتو اور بنگالی وغیرہ میں حضور نبی کریم ﷺ کی موزوں مدح وثناء نعت کہلاتی ہے۔ اہلِ فن کا اتفاق ہے کہ اس انداز کی نعت ایک مشکل صنف ہے۔ دوسری زبانوں کی طرح اُردو شاعری میں بھی نعت کا موضوع اپنے اندر بڑی دل کشی رکھتا ہے۔ اس لیے کہ یہ موضوع ایک ایسی ذاتِ والا صفات سے وابستہ ومنسلک ہے کہ جس کی عظمت لامحدود اور جس کی وسعت بے پایاں ہے۔ اُردو میں نعت گوئی کی روایت نئی نہیں بلکہ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ اُردو شاعری۔ عشقِ رسول ﷺ کا بیان اور شوقِ سفرِ مدینہ کے تذکرے، ہندوستانی شعراء کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ فارسی کے بعد سب سے مؤثر نعتیں اُردو ہی میں ملتی ہیں۔

لیکن اُردو شاعری میں نعت کا فن کبھی بھی ایک مستقل صنفِ سخن کی حیثیت سے معروف نہیں رہا ہے۔ مختلف زمانوں میں اس موضوع کو مختلف ہیئتوں میں برتا گیا ہے۔ اور اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث اس کی حیثیت ایک مستقل صنفِ سخن کی ہوگئی ہے۔ اگر چہ نعت، شاعری کی مختلف ہیئتوں مثلاً قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی، قطعہ، مسدس وغیرہ میں سے کسی میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کے موضوع سے انحراف کی گنجائش نہیں۔ اس تحدید کی بناء پر بظاہر نعت کا موضوع تنگ دکھائی دیتا ہے کیوں کہ اس کی حدیں سیرتِ نبی کریم ﷺ کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ لیکن کیوں کہ اس موضوع کا تعلق دنیا کی عظیم اور بزرگ ترین ہستی اور شخصیت سے ہے۔ لہٰذا آپ کی بلند پایہ سیرتِ مبارکہ کے توسط سے نعت کے موضوعات میں انسانی زندگی کے بیشتر مسائل ومباحث شامل ہو جاتے ہیں۔ [1]

دکن اور شمالی ہندوستان میں نعت گوئی کے ابتدائی نقوش سے لے کر بیسویں صدی عیسوی تک نمایاں نعت گو شعراء کے تفصیلی جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے [2] کہ اُردو زبان میں نعت کسی خاص ہیئت کے ساتھ مخصوص نہیں رہی۔ مثنوی، مسدس، مخمس، ترکیب بند، ترجیع بند، قصیدہ، رباعی، قطعہ، غزل، تمام ہی اصناف میں نعت گو شعراء نے اپنی جولانیٔ طبع کی بہاریں پیش کی ہیں۔ لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ بالکل ابتدائی دور میں غزل کی ہیئت میں نعتیہ شاعری کے نمونے کم دکھائی دیتے ہیں لیکن جیسے جیسے بیسویں صدی آگے قدم بڑھاتی ہے ویسے ویسے غزل کی ہیئت نعتیہ شاعری کے لیے

نمایاں حیثیت اختیار کرتی چلی گئی۔ اور بہت سے شاعروں کے علاوہ محسن کاکوروی (۱۸۲۶ء۔۱۹۰۵ء) اور امیر مینائی (۱۸۲۹ء۔۱۹۰۰ء) نے نعت گوئی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ ان دونوں اکابرین کے یہاں قصائد اور غزل، نعتیہ موضوعات کی پیش کش میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

''مولانا احمد رضا خان بریلوی (۱۸۵۶ء۔۱۹۲۱ء) کا تعلق بھی اسی زمانے سے ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کی نعتیہ شاعری میں ہمیں تقریباً تمام ہی مروجہ ہیئتیں مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، مستزاد، قطعہ اور مسدس بہ شکل ترجیع بند ملتی ہیں۔

کالی داس گپتا رضا نے احمد رضا کے شاعرانہ کمالات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اسلامی دنیا میں ان کے مقامِ بلند سے قطع نظر ان کی شاعری بھی اس درجے کی ہے کہ انیسویں صدی کے اساتذہ میں برابر کا مقام دیا جائے۔ ذرا غور و فکر کے بعد ان کے اشعار ایک ایسے شاعر کا پیکر دل و دماغ پر مسلط کر دیتے ہیں جو محض ایک سخن ور کی حیثیت سے بھی اگر میدان میں اُترتا تو کسی اُستادِ وقت سے پیچھے نہ رہتا۔ ان کے کلام سے ان کے کامل صاحبِ فن اور مسلم الثبوت شاعر ہونے میں شبہ نہیں'' ۔[۳]

احمد رضا کی شاعری میں اُردو کلاسیک کے وہ اوصاف مجتمع ہیں جو کلام کو آفاقیت عطا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ احمد رضا کی نعتیہ شاعری نے ہر دور میں مقبولیت حاصل کی، اُن کے کلام میں آج بھی وہ تازگی پائی جاتی ہے جو پڑھنے والوں کو مسحور کر دیتی ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ وہ اصنافِ ادب ہیں جنھیں احمد رضا نے اپنی نعتیہ شاعری کے لیے منتخب کیا اور اس بارے میں دو آراء نہیں ہوسکتیں ہیں کہ انھوں نے نعتیہ شاعری کے لیے ہیئت کے جو بھی تجربے کیے اُس میں وہ کامیاب رہے اسی بنا پر احمد رضا اُردو کے اُن ابتدائی نعت گو شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں جن کی نعتیہ شاعری میں ہیئت کے حوالے سے منفرد تنوع ملتا ہے۔

اب ہم اُن کی شاعری سے چند اہم اصناف کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

مثنوی:

احمد رضا کے دیوان ''حدائقِ بخشش'' میں ایک مثنوی بہ عنوان ''مثنوی الوداع جبہ'' ہے جو ستر اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی میں سرکارِ اقدس ﷺ کے جبۂ مقدسہ کی رخصتی پر رضا نے رنج و حسرت کا اظہار کیا ہے۔ زبان سادہ اور سلیس ہے۔ کہیں کہیں فارسی کے الفاظ آ گئے ہیں مگر عام فہم ہیں۔ منظر کشی، روانی اور تسلسلِ موضوع برقرار ہے۔ یہ مثنوی تلمیحاتی فضا سے پاک ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

آج کیا ہے جو ہیں سب گریہ کناں
خاک برسر چشم تر سینہ زناں

کیوں تڑپتا ہے مرا دل بے قرار
کیا ہوا آنکھوں کو کیوں ہیں اشک بار

گرمیِ بازار خور کیوں سرد ہے
کیا ہوا مہ کو جو چہرہ زرد ہے

ماتمی پوش آج کیوں ہے آسماں
کیوں زمیں سکتے میں ہے آئینہ ساں

شعر میرے دے رہے ہیں بوئے خوں
ٹپکے ہے ہر بات سے رنگِ جنوں

ترجیع بند:

دیوانِ احمد رضاؔ میں دو ترجیع بند ہیں۔ پہلا بند فارسی میں ہے۔ ترجیعی بیت بھی فارسی کا ہے۔ دوسرا ترجیع بند نامکمل ہے۔ اس کا بھی پہلا بند فارسی میں ہے اور ترجیعی بیت بھی فارسی کا ہے۔ اس کے علاوہ دیوان میں تین خمسے ہیں۔ پہلا خمسہ سولہ بند کا، دوسرا نامکمل چار بند کا، اور تیسرا سولہ بند کا۔ پہلا اور تیسرا خمسہ قاسم کی نعت پر تضمین ہے۔ دوسرا خمسہ بھی تضمین ہی ہے۔ نعتِ قاسمؔ کو احمد رضاؔ نے اپنے قلم کی سحر طرازی سے لاجواب خمسہ بنا دیا ہے۔ پہلے خمسے سے مثال ملاحظہ فرمایئے:

شعلۂ عشقِ نبی سینے سے باہر نکلا
عمر بھر مُنھ سے مرے وصفِ پیمبر نکلا
سازگار ایسا بھلا کس کا مقدر نکلا
دم مرا صاحبِ لولاک کے در پر نکلا
اب تو ارمان ترا اے دلِ مضطر نکلا

دوسرے نامکمل خمسے کا ایک بند یہ ہے:

بستگی میں تھا مرے غنچۂ دل کو یہ گماں
سو نسیمیں چلیں، کھلنا تھا مگر اس کا محال
دفعتہً کیا ہوا اس حال نے پایا جو زوال
صرصرِ دشتِ مدینہ کا مگر آیا جو خیال
رشکِ گلشن سے جو بنا غنچۂ دل وا ہو کر

تیسرے خمسے کے مقطع کا بند یوں ہے:

اے کاش شانِ رحمت میرے کفن سے نکلے
جاں بوئے گل کی صورت باغِ بدن سے نکلے
ارماں طفیلِ نامِ شاہِ زمن سے نکلے
حسرت ہے یا الٰہی جب جان تن سے نکلے
نکلے تو نامِ اقدس لے کر دہن سے نکلے

رباعی:

احمد رضا کے نعتیہ کلام میں رباعیات بھی قابلِ ذکر تعداد میں ہیں۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

اللہ کی سرتا بہ قدم شان ہیں یہ
ان سا نہیں انسان، وہ انسان ہیں یہ
قرآن تو ایمان بتاتا ہے انھیں
ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ

نورِ رخِ سرکار کا عجب جلوہ ہے
آٹھوں پہر اس کوچے میں دن رہتا ہے
یہ شامِ مدینہ نہ سمجھنا اے دل
آہِ دلِ عاشق کا دھواں چھایا ہے

رباعی کا حسن اور اس کی کامیابی کا انحصار اس کے چوتھے مصرعے کی بے ساختگی اور برجستگی پر ہوتا ہے۔ اور سارا مفہوم و مغز اسی سے ظاہر ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا رباعیوں سے احمد رضا کی فنی چابک دستی عیاں ہے۔ مضامین، خیالات اور افکار بہت بلند مگر نازک اور سنجیدہ ہیں۔ انھوں نے سادہ زبان میں اپنی تخلیقی توانائی اور جذبے کی تب و تاب کو بروئے کار لاکر ان رباعیات کو شعری حسن اور فکری وقار کا پیکر بنا دیا ہے۔

مستزاد:

احمد رضا کے دیوان میں صنف ''مستزاد'' کی مثال بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن اُنھوں نے ہر شعر کے بعد صرف مصرعِ ثانی کے ساتھ آدھے آدھے مصرعے کا اضافہ کیا ہے۔ اس طرح مستزاد کی ایک نئی طرز نکالی ہے۔ پھر اسی میں ایک قطعہ کہا ہے، جس میں اپنے دل کے کھو جانے کی روداد، نہایت پُر کیف

اور لطیف انداز میں بیان کی ہے۔ اس مستزاد میں صنعتِ تجاہل عارفانہ، اقتباس اور تلمیح بھی ہیں۔ کسی کسی شعر میں تین تین ٹکڑے، ہم قافیہ استعمال کر کے ''صنعتِ مسمط'' کی بہار بھی دکھائی ہے۔ لکھتے ہیں:

وہی رب ہے جس نے تجھ کو ہمہ تن کرم بنایا
ہمیں بھیک مانگنے کو ترا آستاں بتایا
تجھے حمد ہے خدایا
یہی بولے سدرہ والے، چمنِ جہاں کے تھالے
سبھی میں نے چھان ڈالے ترے پائے کا نہ پایا
تجھے یک نے یک بنایا

یہ مستزاد، دل کی کشمکش کی کہانی ہے، جس کا بڑی خوب صورتی اور نزاکت کے ساتھ رضؔا نے قطع بند اشعار میں اظہار کیا ہے۔ اس مستزاد میں انھوں نے جذبات نگاری کو کمال عطا کیا ہے۔

قطعہ:

صنفِ قطعہ میں نعتیہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

عالم ہمہ صورت اگر جاں ہے تو، تُو ہے — سب ذرّے ہیں گر مہرِ درخشاں ہے تو، تُو ہے
پروانہ کوئی شمع کا، بلبل کوئی گل کا — اللہ ہے شاہد مرا، جاناں ہے تو، تو ہے
طالب میں ترا، غیر سے ہرگز نہیں کچھ کام — گردیں ہے تو، تُو ہے، ایماں ہے تو، تو ہے

قصیدہ:

اگر ہم صنف وار جائزہ لیں تو احمد رضؔا کے نعتیہ دیوان ''حدائق بخشش'' میں ان کے قصائد کی کل تعداد بارہ ہے۔ چار قصائد حصہ اوّل اور دوم میں اور چھے قصائد حصہ سوم میں ہیں۔ حصہ سوم میں دو غیر مکمل قصیدے بھی ملتے ہیں۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ احمد رضؔا نے ہر قصیدے میں نعت کی فضا کو بدرجہ اتم برقرار رکھا ہے۔ اُن کے ہاں کسی بھی موقعے پر نہ نعت کی فضا مجروح و مکدر ہوتی نظر آتی اور نہ قصیدے کا فن متاثر ہوتا ہے، چنانچہ قصیدے میں نعت کے موضوعات کو پیش کرنے کا یہ کامیاب تجربہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر کے مطابق:

> ''قصیدہ نگاری کے فنی لوازمات میں اہم ترین، چار ارکان ہیں، تشبیب یا نسیب، گریز، مدح/ذم، دعا۔ تشبیب کا پہلا شعر قصیدے کا پہلا شعر و مطلع ہوتا ہے اور یہیں سے شاعر کے کمال کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ مطلع کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ بلند

پایہ اور شگفتہ ہو۔ اس میں کوئی فنی اور جدت آمیز بات بیان کی جائے تا کہ سننے والا ہمہ تن گوش ہو جائے اور بعد کے اشعار کا اچھا اثر مرتب ہو"۔ ۵

لہٰذا ڈاکٹر سراج احمد بستوی رقم طراز ہیں:

''حضرت رضا نے اپنے تمام قصائد میں مذکورہ شرائط کا اہتمام رکھا ہے۔ چنانچہ جب وہ قصیدۂ معراجیہ کا آغاز فرماتے ہیں تو اس کی تشبیب کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:

وہ سرورِ کشورِ رسالت جو عرش پر جلوہ گر ہوئے تھے
نئے نرالے طرب کے ساماں عرب کے مہمان کے لیے تھے

اور اپنے شہرۂ آفاق قصیدے ''قصیدہ در اصطلاحاتِ علمِ نجوم و ہیئت'' کی تشبیب کا آغاز اس طرح فرماتے ہیں:

خالقِ افلاک نے طرفہ کھلائے چمن
اک گلِ سوسن میں ہیں لاکھوں گلِ یاسمن'' ۵

چوں کہ قصیدے کی کامیابی اس کی تشبیب پر مبنی ہوتی ہے۔ اور خاص طور پر اس کے مطلع کو تو اتنا وقیع اور جان دار ہونا چاہیے کہ سامع مطلع سنتے ہی ہمہ تن توجہ ہو جائے، اسی لیے عربی شعراء تشبیب میں عشقیہ مضامین ہی قلم بند کرتے تھے۔ عربی کے اثرات کے باعث فارسی اور اُردو میں بھی یہ روایت بڑی حد تک قائم ہے۔ مگر اُردو قصیدہ نگاروں نے عشقیہ مضامین کے علاوہ دیگر مضامین بھی قلم بند کیے ہیں۔

قصیدے کا دوسرا رکن گریز ہے۔ جس کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ تشبیب و مدح کے درمیان ربط پیدا کرنے کے لیے شاعر اپنی تمام تر صلاحیتوں کا ثبوت بہم پہنچائے۔ حقیقتاً قصیدہ گو کی صلاحیت کی کسوٹی یہی ہے۔ مثلاً احمد رضا کے قصیدے میں گریز کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

مدحت غائب ہوئی شوق کی آتشِ فروز
گل کی حضوری میں ہو بلبلِ جاں نغمہ زن

جانِ دو عالم نثار وہ ہے مرا تاج دار
جس کو کہیں جان و دیں جانِ من ایمانِ من

مدحِ حسیناں نہ کہہ وصفِ امیراں نہ کر
خلق انھی کی حسیں خلق انھی کا حَسن

''قصیدے کا تیسرا حصہ مدح ہے۔ جس میں شاعر ممدوح کے اوصاف بیان کرتا ہے۔ اس کے عموماً دو ضمنی اجزاء بھی ہوتے ہیں۔ گریز کے بعد پہلے ممدوح کی تعریف صیغۂ غائب میں کی جاتی ہے جس کو مدحِ غائب کہتے ہیں۔ مدحِ حاضر کی ابتداء بیشتر نئے مطلع سے کی جاتی ہے۔'' ۲ قصیدے میں اس حصے کو قصیدہ گوئی کے فن میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ خاص طور پر نعتیہ قصائد میں شاعر کو اپنی استعداد کے مطابق حضورِ اکرم ﷺ کے فضائل کو نئی نئی جہات اور سمتوں میں بیان کرنے کا موقع ملتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ احمد رضا، غائب سے حاضر کی طرف گریز کرتے ہوئے مدح فرماتے ہیں:

مدحت غائب ہوئی شوق کی آتشِ فروز
گل کی حضوری میں ہو بلبلِ جاں نغمہ زن

مدح کے بعد شاعر، قصیدے کے آخری رکن، دعا یا عرضِ حال کی طرف پلٹتا ہے۔ احمد رضا اس طرز کے مطابق اپنے ایک قصیدے میں فرماتے ہیں:

نبیِ رحمت شفیعِ اُمت رضا پہ للہ ہو عنایت
اسے بھی ان خلعتوں سے حصہ جو خاص رحمت کے واں بٹے تھے
ثنائے سرکار ہے وظیفہ قبولِ سرکار ہے تمنا
نہ شاعری کی ہوس نہ پروا، روی تھی کیا کیسے قافیے تھے

مذکورہ بالا چار قصائد کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ذریعے احمد رضا نے پہلی بار اُردو کے نعتیہ ادب میں تشبیب کے مضامین میں وہ وسعت و معنویت پیدا کی ہے جس کی اس سے قبل کے نعتیہ ادب (اُردو/ فارسی/ عربی) میں بہت مشکل سے نظیر ملے گی۔ بلکہ بعض جہتوں سے آپ نے تشبیہ استعارہ، کنایہ، تشبیب، ردیف و قوافی کا نئے انداز سے جو اہتمام و استعمال کیا ہے وہ آپ کی اپنی ایجادات و اوّلیات ہیں۔

اب قصیدۂ سلامیہ کی طرف آتے ہیں جس کی بابت علامہ شمس بریلوی لکھتے ہیں:

''حضرت رضا بریلوی قدس سرہٗ کا وہ سلام محبت آگیں جس کا مطلع 'مصطفیٰ جانِ رحمت ....' ہے، ہر اس مسلمان کے دل کی آواز ہے جس کا دل محبتِ سرکارِ دو عالم ﷺ سے معمور ہے۔ اس سلام میں عجیب والہانہ جذبات اور وارفتگی کا عالم نظر آتا ہے۔ ان اشعار میں سراپائے قدس سے جو پارہ ہائے نور یعنی اعضائے پاک، خامۂ رضا نے منتخب کیے ہیں، ان کی کما حقہٗ تعریف نظم تو نظم، نثر میں بھی دشوار ہے''۔ ۷

اسی طرح احمد رضا کا قصیدۂ درودیہ بھی، جس کا مطلع ہے:

کعبے کے بدرالدجےٰ تم پر کروروں درود
طیبہ کے شمس الضحیٰ تم پہ کروروں درود

ان کے تبحرِ علمی، قادرالکلامی اور سب سے بڑھ کر فیضِ عشق مصطفےٰ ﷺ کا مظہر ہے۔ جس نے رضاؔ کے سامنے مضامین و الفاظ کے انبار لگا دیے۔ ساٹھ اشعار پر مشتمل اس ذوقافیتین قصیدے میں حروفِ ہجا کا خاص التزام رکھا گیا ہے۔ عشقیہ شاعری میں شعرا نے ذوقافتین غزلیں تو کہی ہیں لیکن حروفِ ہجا کا التزام کہیں نظر نہیں آتا۔ نعتیہ شاعری میں تو احمد رضاؔ سے قبل اس کی کوئی مثال اُردو شاعری میں نہیں ملتی۔ علامہ شمس الدین نے اس کو اوّلیاتِ رضاؔ میں شمار کیا ہے [۸] نظام الدین بیگ نے اسے شبِ معراج کا تہنیت نامہ قرار دیا ہے۔[۹] جب کہ ڈاکٹر محمد مسعود احمد نے اس قصیدے کو احمد رضا کی شاعری کا کمال کہا ہے۔[۱۰]

افتخار عارف نے احمد رضا کے قصائد پر بہت عمدگی سے سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ:

''قصیدۂ سلامیہ، قصیدۂ معراجیہ، قصیدۂ درودیہ، جس طرح کی فضا بنانی ہوتی ہے پھر ساری آئینہ بندی اسی نوعیت کی۔ آہنگ، بحر، زبان، لہجے، بندشیں، ترکیبیں، موسیقی سب عناصر باہم پیوست نظر آتے ہیں۔ صناعی تمام و کمال مگر حسن کے ساتھ، مصرعے صاف، جذبے خالص، بیان واضح۔ محبت رسول ﷺ کی شدت و وارفتگی نے نعت کو اعجازِ سخن کی منزلوں سے ملا دیا ہے۔ کہیں سے بھی 'حدائقِ بخشش' کھول لیجیے۔ پڑھتے چلے جایئے اور پاک ہوتے جایئے۔ صنائع بدائع تواتر کے ساتھ۔ تجنیس، ایہام، تناسب، تضاد و طباق، مراعاۃ النظیر، حسنِ تعلیل، تلمیح سب ہے مگر کرتب سازی کی طرح نہیں، حضوری کے معجزوں کے ساتھ''۔[۱۱]

علامہ شمس بریلوی نے مذکورہ قصیدے کے اسّی اشعار کی تشریح کی ہے جو 'معارف رضا'، کراچی، شمارہ چہارم، ۱۹۸۴ء، شمارہ ہفتم، ۱۹۸۷ء، اور شمارہ ہشتم، ۱۹۸۸ء میں قسط وار شایع ہوئی ہے۔

الغرض احمد رضاؔ کے نعتیہ قصیدے فنی، فکری اور تسکینِ قلبی کے حوالے سے اُردو شاعری میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

غزل:

عام طور پر اصناف سخن میں غزل کو اظہار کا بہترین وسیلہ گردانا جاتا ہے۔ اور اس میں شک بھی نہیں کہ غزل باریک سے باریک جذباتِ عشق کو اپنے میں سمونے اور اظہار کے رنگارنگ زاویے تراشنے میں بڑا مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ بات اس حسن سے کہی جائے کہ سننے والا اسے اپنے دل کی بات سمجھ لے، یہ ہے غزل کا بنیادی وصف۔ غالباً یہی سبب ہے کہ بے شمار صوفیاء، شعراء، فقراء، اور اہلِ تصوّف نے اپنی بات کو قاری کے دل میں اُتارنے کے لیے غزل ہی کا انتخاب کیا ہے۔

شاعری کا موضوع خواہ کچھ بھی ہو، شاعر سے جذبات کی شدت اور پاکیزگیِ خیالات کا تقاضہ کیا جاتا ہے۔ گویا جذباتی صداقت کے بغیر محض علمی صداقت کے زور پر اعلیٰ درجے کی شاعری جنم نہیں لے سکتی۔ اسی معیار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جب ہم احمد رضا کی نعتیہ شاعری کا تجزیہ کرتے ہیں تو کتنی ہی مثالیں ایسی نظر آتی ہیں جو فن پر مکمل عبور اور قادر الکلامی کی نادر مثالیں قرار پاتی ہیں، اسی حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ان (احمد رضا) کے یہاں غزل کے پیرائے میں لمبی لمبی نعتیں ملتی ہیں اور بعض نعتوں میں بڑی مشکل زمینوں اور ردیفوں میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی محبت کا تیز دھارا سنگلاخ زمینوں کو چیرتا ہوا اس طرح گزر گیا کہ شادابی و زرخیزی کے جو آثار احمد رضا صاحب کی ان نعتوں میں پیدا ہو گئے ہیں وہ دوسروں کے ہاں نرم اور ہموار زمینوں میں بھی نظر نہیں آتے'' ۔[۱۲]

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں ۔۔۔ تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں
مجھ سا کوئی غم زدہ نہ ہوگا ۔۔۔ تم سا نہیں غم گسار آقا
جس خاک پہ رکھتے تھے قدم سیدِ عالم ۔۔۔ اُس خاک پہ قرباں دلِ شیدا ہے ہمارا
ہم خاک اُڑائیں گے جو وہ خاک نہ پائی ۔۔۔ آباد رضا جس پہ مدینہ ہے ہمارا
میرے ہر زخمِ جگر سے یہ نکلتی ہے صدا ۔۔۔ اے ملیحِ عربی کر دے نمک داں ہم کو
وہ تو نہایت سستا سودا بیچ رہے ہیں جنت کا ۔۔۔ ہم مفلس کیا مول چکائیں اپنا ہاتھ ہی خالی ہے

مختصر بحروں میں طبع آزمائی ایک دشوار فن ہے۔ مگر احمد رضا نے چھوٹی بحروں کا بھی انتخاب کیا اور چابک دستی کے ساتھ ان میں اپنی فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا:

زہے عزت و اعتلائے محمد

کہ ہے عرشِ حق زیرِ پائے محمد

بزمِ آخر کا شمع فروزاں ہوا

نورِ اوّل کا جلوہ ہمارا نبی

جس نے مردہ دلوں کو دی عمرِ ابد

ہے وہ جانِ مسیحا ہمارا نبی

مولانا احمد رضا خان کی شاعری اکتسابی نہیں، وہبی ہے۔ لفظوں کی نہیں جذبوں کی شاعری ہے اوران کے یہاں تخلیقی شان پائی جاتی ہے۔ ان کی نعت گوئی جن خارجی اوصاف سے مزین ہے وہ کہیں بھی ان کے اظہارِ جذبات یا ترسیلِ فکر میں حارج نہیں ہوتے۔ اور یہیں آ کر فنی دسترس اور قادر الکلامی کے اعلیٰ ترین جواہر پاروں سے ان کی شاعری آراستہ ہوتی ہے۔ احمد رضاؔ نے حضورِ اکرم ﷺ کا تقابل دیگر انبیائے کرام سے بھی کیا ہے لیکن انبیائے کرام کی عظمت و بزرگی کوملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ کہتے ہیں:

حسنِ یوسف پہ کٹیں مصر میں انگشتِ زناں

سر کٹاتے ہیں ترے نام پہ مردانِ عرب

آپ نے بعض بے حد سنگلاخ زمینوں میں بھی نعتیں کہیں ہیں۔ (علامہ شمس بریلوی نے احمد رضاؔ کے اس ہنر کی طرف متوجہ کیا ہے) مثلاً مرزا غالبؔ کی زمین: ''غنچۂ نا شگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں'' پر احمد رضا نے بڑی کامیاب نعت کہی ہے:

پوچھتے کیا ہو عرش پر یوں گئے مصطفٰے کہ یوں

کیف کے پر جہاں جلیں کوئی بتائے کیا کہ یوں

غالبؔ کا مقطع ہے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کر ہو رشکِ فارسی

گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کر اسے سنا کہ یوں

احمد رضاؔ کا مقطع اس طرح ہے:

جو کہے شعر و پاسِ شرع دونوں کا حسن کیوں کر آئے

لا اسے پیشِ جلوۂ زمزمۂ رضاؔ کہ یوں

غالبؔ ہی کی ایک اور غزل ہے۔ (اور اس زمین میں داغؔ کی غزل بھی مشہور ہے)

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

احمد رضا کی نعت اس زمین میں دیکھیے:

پھر کے گلی گلی تباہ ٹھوکریں سب کی کھائے کیوں
دل کو جو عقل دے خدا تیری گلی سے جائے کیوں

غالب نے تو کہا تھا:

جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

لیکن احمد رضا کہتے ہیں:

یادِ حضورؐ کی قسم غفلتِ عیش ہے ستم
خوب ہیں قیدِ غم میں ہم، کوئی ہمیں چھڑائے کیوں

اسی ردیف میں قافیے کی تبدیلی کے ساتھ ایک اور نعت ملاحظہ کیجیے:

یادِ وطن ستم کیا، دشتِ حرم سے لائی کیوں
بیٹھے بٹھائے بد نصیب سر پہ بلا اُٹھائی کیوں

اس کے علاوہ:

تھک کے بیٹھے تو درِ دل پہ تمنائی دوست
کون سے گھر کا اُجالا نہیں زیبائی دوست
رونقِ بزمِ جہاں ہیں عاشقانِ سوختہ
کہ رہی ہے شمع کی گویا زبانِ سوختہ

احمد رضا خاں کے تبحرِ علمی اور وسعتِ فکری کے سامنے شعر گوئی حیثیت نہیں رکھتی، لیکن آپ نے شاعری برائے شاعری نہیں کی بلکہ اپنے اظہارِ مسلک کا ذریعہ بنایا اور اپنے کلام کی بلاغت سے اُردو شاعری کے دامن میں صالح شعر وادب کے وہ موتی بکھیرے جس کی مثال اُردو شاعری میں کم ملے گی۔ ان کی نعت کا یہ مقطع تعلّی نہیں بلکہ حقیقت ہے:

یہی کہتی ہے بلبلِ باغ جناں کہ رضا کی طرح کوئی سحر بیاں
نہیں ہند میں واصف شاہ ہدیٰ تجھے شوخیِ طبع رضا کی قسم

احمد رضا کا زمانہ شاعری وہ ہے جب کہ ابھی اُردو زبان تجربات کی حدود سے باہر نہیں نکلی تھی اور بڑے بڑے اکابر شعرائے کرام زبان میں تجربات کی گلکاریاں کر رہے تھے۔ اس ماحول میں بے شک

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی شاعری اُردو ادب کے لیے ایک گراں قدر سرمایہ ہے۔ آپ کی شاعری شگفتگیِ زباں اور دل نشیں بیان کے اعتبار سے اُردو کے چند اہم شعراء کے ساتھ رکھے جانے کے قابل ہے۔ الفاظ کا لامحدود خزانہ، فن کی عرق ریزیوں کے ساتھ پڑھنے والوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ آپ کی شاعری کے بارے میں یہ رائے بالکل صادق آتی ہے کہ عہدِ جدید میں آپ اُردو غزل کے ایک ''مجتہد'' کی حیثیت رکھتے ہیں جو کہ محض زبان و بیاں کی دل کشی پر ہی یقین نہیں رکھتا بلکہ موضوعِ بیان (نعت) کی سچائی اور واقعیت پر بھی گہرا ایمان رکھتا ہے۔

حواشی

۱) تفصیلی مطالعے کے لیے ملاحظہ کیجیے: ''مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی نعتیہ شاعری'' از بستوی، دہلی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۶۵۔ اور ''اُردو قصیدہ نگاری'' از ڈاکٹر ابو محمد سحر، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ص ۱۴۔
۲) تفصیلی مطالعے کے لیے ملاحظہ کیجیے از ڈاکٹر ریاض مجید، ''اُردو میں نعت گوئی''، اقبال اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۰ء۔
۳) کالی داس گپتا رضا: ''رضا، داغ اور امیر'' مشمولہ معارفِ رضا، کراچی، شمارہ ہشتم، ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۷۔
۴) ڈاکٹر ابو محمد سحر: ''اُردو میں قصیدہ نگاری''، ص ۱۷۔
۵) ڈاکٹر سراج احمد بستوی: ''مولانا احمد رضا خاں کی نعتیہ شاعری''، ص ۲۸۴۔
۶) ایضاً
۷) شمس بریلوی: ''کلامِ رضا کا تحقیقی و ادبی جائزہ، مع حدائقِ بخشش، کامل''، مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۲۲۰۔
۸) ایضاً۔
۹) مرزا نظام الدین بیگ: ''قصیدۂ معراجیہ'' مشمولہ: معارفِ رضا، کراچی، شمارہ ۱۹۹۳ء، ص ۱۶۶۔
۱۰) ڈاکٹر محمد مسعود احمد: ''آئینۂ رضویات''، سوم، مرتبہ محمد عبدالستار طاہر، ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۳۰۔
۱۱) افتخار عارف: ''فاضل بریلوی کی اُردو نعت گوئی'' مشمولہ معارفِ رضا، کراچی، شمارہ ۱۷، ۱۹۹۷ء، ص ۱۲۹۔
۱۲) ڈاکٹر فرمان فتح پوری: ماہنامہ ''نگار'' پاکستان، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۷۰۔

کتابیات

۱۔ بستوی، سراج احمد، ڈاکٹر: ''مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی نعتیہ شاعری''، دہلی، ۱۹۹۷ء۔
۲۔ ریاض مجید، ڈاکٹر: ''اُردو میں نعت گوئی''، لاہور، اقبال اکیڈمی، ۱۹۹۰ء۔
۳۔ سحر، ابو محمد، ڈاکٹر: ''اُردو قصیدہ نگاری''، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو۔
۴۔ شمس، بریلوی: ''کلامِ رضا، تحقیقی و ادبی جائزہ مع حدائقِ بخشش'' حصہ سوم، کراچی، مدینہ پبلشنگ کمپنی، ۱۹۷۶ء۔

رسائل

۱۔ ''معارفِ رضا''، کراچی، شمارے: ۴، ۷، ۸، ۱۶، ۱۷۔
۲۔ ''نگار''، کراچی، شمارہ ۳، ۲۰۰۱ء۔

ڈاکٹر محمد یوسف خشک

عالم گیریت اور ادب پڑھانے کے جدید رجحانات

موضوع بذاتِ خود دو حصّوں میں تقسیم شدہ ہے، اس کا پہلا حصّہ عالم گیریت کے زیرِ عنوان ہے، اس لیے علاقائی حد بندی یا دھرتی پر جغرافیے کی انسانی لکیروں سے نکل کر پہلے چند بنیادی اور نمایاں ایسے عالم گیر عناصر پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو تمام دنیا کے لوگوں کے لیے یکساں ہیں۔ ان کو مندرجہ ذیل تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ عالم گیر نعمتیں
۲۔ عالم گیر مسائل
۳۔ عالم گیر خواہشیں

اس کائنات میں چند عالم گیر نعمتیں ہیں جو سب کے لیے ہیں:

۱	زمین	۲	پانی	۳	ہوا
۴	درخت	۵	پہاڑ	۶	آگ
۷	رنگ	۸	روشنی (دن)	۹	آسمان
۱۰	سورج	۱۱	اندھیرا (رات)	۱۲	چاند
۱۳	ستارے				

اس کائنات کے چند عالم گیر مسائل جو سب کے ہیں اور سرِ فہرست ہیں:

۱۔	موت	۲۔	پاگل پن	۳۔	جھوٹ
۴	منافقت	۵۔	خوف	۶۔	بھوک

عالم گیر انسانی خواہشیں:

۱۔ خواہش برائے آسائشِ جسمانی

۲۔ خواہش برائے آسائشِ تحفظ

۳۔ خواہش برائے آسائشِ فرار

۴۔ خوشامد کرنا (ہر اس شخص یا شے سے جو نقصان پہنچا سکے)

۵۔ دکھاوے کا جذبہ

۶۔ خواہشِ فریفتگی

۷۔ خواہشِ نگرانی (اپنے سے نسبتاً کمزوروں کی دیکھ بھال)

۸۔ خواہشِ رفاقت

۹۔ گروہ پسندی

۱۰۔ قابو پانا

۱۱۔ معلوم کرنا یا جاننا

۱۲۔ جانے پہچانے، مانوس مقامات حالات اور لوگوں کی طرف لوٹنا۔(۱)

دنیا میں کسی بھی انسان کے تمام مثبت ومنفی عمل یا موضوع وہ زراعت کا ہو یا بائلا جیکل سائنس، کیمسٹری، کمپیوٹر سائنس، ارتھ سائنسز، انجینئرنگ مینجمنٹ سائنس، ریاضی، فارمیکوٹیکل اینڈ بایومیڈیکل سائنس، فزکس، انوائرمینٹل سائنس، مصوری، ادب، لسانیات، جغرافیہ، آثار قدیمہ، اینتھروپالوجی، سوشیالوجی، سیاسیات، تاریخ، معاشیات وغیرہ ان دائروں سے ہمیں باہر نہیں دکھائی دیتے، سائنس دان ہو، تاجر ہو، ماہر زراعت ہو یا ریڈیو کیشنٹ، ان کا کوئی عمل مندرجہ بالا تین دائروں (عالم گیر نعمتوں، عالم گیر مسائل، عالم گیر خواہشوں) کے محور سے باہر نہیں ہوتا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بنیادی نعمتیں، سہولیات ومسائل یکساں ہونے کے باوجود مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اقوام کی ترقی کے درمیان فرق کیوں ہے؟ کوئی پس ماندہ، کوئی ترقی پذیر، کوئی ترقی یافتہ کیسے ہُوا؟ تو تاریخ اور حال کے آئینے میں اس کا جواب واضح ہے کہ ان اقوام نے اجتماعی طور پر اپنی طبیعت اور کردار کی تشکیل میں مختلف ترتیبیں مختلف تجربات اور مختلف ماحول کی بدولت کچھ ایسی غیر جبلی عادات اختیار کر لی ہیں کہ مخصوص بنیادی خواہشات نے اپنے اظہار کے لیے دوسری راہ بنالی ہے اور یہی وجہ ہے جس کی بنیاد پر یہ پس ماندگی، ترقی پذیری اور ترقی یافتہ کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

ہمارے ملک یا اکثر ترقی پذیر ممالک میں ادب کو باقاعدہ دل چسپی کے ساتھ پڑھنے کے رجحان کی وہ حیثیت نہیں رہی جو صدیوں پہلے تھی، جب کہ ترقی یافتہ ممالک میں، جو تقریباً تمام میدانوں میں آگے نکلے ہوئے ہیں، ان کے معاشرے میں ادب کو آج بھی وہی اہمیت حاصل ہے۔ اگر کہیں پر وہ سب سے آگے نہ سہی تو سب کے ہم قدم ضرور ہیں۔ اس سلسلے میں جب راقم نے دنیاوی ادب کے مقابلے میں ملکی سطح پر لکھے جانے والے ادب پر سرسری نظر دوڑائی تو محسوس ہوا کہ ہمارے تخلیق کار یا ادیب میں تخلیقی اعتبار سے کوئی کمی نہیں پائی جاتی، بلکہ کہیں کہیں، کئی کئی منزلیں ہمارا تخلیق کار آگے دکھائی دیتا ہے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہمارے ہاں ہی معاملہ الٹ کیوں ہے؟ جب کہ ہمارے ادیب میں تخلیقی اعتبار سے کوئی کمی نہیں۔ تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہمارے اکثریت اور تعلیمی اداروں نے ہمیشہ روایتی انداز میں تخلیق کے اندر صرف چند مقاصد پر توجہ مرکوز رکھی ہے، جس کے نتیجے میں ادب سے دل چسپی رکھنے والوں کا حلقہ محدود ہوتا جا رہا ہے۔ دیگر الفاظ میں یوں کہا جائے کہ ہمارا ادیب آج بھی اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ طاقت سے لکھ رہا ہے۔ خامی ادب اور ادیب میں نہیں بلکہ اس پُر آسائش مشینی زمانے میں، ایک تو قاری کے پاس اضافی وقت نہیں ہے اور دوم اس کے پاس option زیادہ موجود ہیں جس کی وجہ سے وہ چوزی، سلکٹیو، سہل پسند ہو گیا ہے۔ وہ اپنے سوال کا فوراً سیدھا جواب چاہتا ہے، اسے جس موضوع کی طلب ہے وہ اس پر براہِ راست پہنچنا چاہتا ہے۔

مجموعی طور پر تعلیمی اداروں کو ہمارے معاشرے کے دماغ کی حیثیت حاصل ہے، اس سوچ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، جب راقم نے ترقی یافتہ ممالک کی جامعات اور کالجز کے نصابات پر نظر ڈالی تو بنیادی نقص، جس نے ادب پڑھنے والوں کی تعداد کم کی ہے دھند لکے سے نکل کر واضح ہوا، کہ ترقی یافتہ ممالک میں ادب سے وابستہ تعلیمی ادارے، محققین، ادب دوست یا جدید رجحانات کو پسند کرنے والے لوگ، تخلیق کار کو پریشان کیے بغیر مختلف زمانی طبقوں کے موضوعات اور قاری کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کی ضرورت کے اعتبار سے اسے مواد پہنچا رہے ہیں اور ایسا مواد تیار کرنے والوں کی خوب ہمت افزائی بھی کر رہے ہیں۔ اس لیے وہاں پر ادب و ادیب کو آج بھی Leading Roll والی حیثیت حاصل ہے۔

اس سلسلے میں ترقی یافتہ ممالک کی جامعات اور کالجز، یونیورسٹی آف واشنگٹن، یونیورسٹی آف ھالینس، انڈیانا یونیورسٹی بلومنگٹن، الباما اسٹیٹ یونیورسٹی، دی یونیورسٹی آف ایڈن برگ، کولمبیا

یونیورسٹی نیویارک، آکسفورڈ یونیورسٹی لنڈن، یونیورسٹیز آف ساؤتھ کوریا، کینیڈین یونیورسٹیز کے ادب کے مضمون سے وابستہ تمام نصابات کے مطالعے کے بعد ان ہی میں سے ادب کو باقاعدہ نئے انداز میں پڑھائے جانے والے چند نصاب کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

سائنس اور ادب ۲ے

یہ مضمون ۲۰۰۷ء تا حال، ادب اور سائنس کے درمیان موجود پرانے اور گہرے تعلقات پر مشتمل ہے، جس کے تحت طالب علموں کو چنیدہ ادبی، سائنسی اور فلسفیانہ کتب کی معرفت، سائنس اور ادب کے مشترکہ تخلیقی عمل پڑھائے جاتے ہیں۔

ادب اور تہذیب ۳ے

اس مضمون کے تحت ادب (شاعری اور نثر کی تمام شاخیں) میں تہذیب کا مطالعہ اس زاویے سے پیش کیا جاتا ہے کہ ادب ایک ثقافتی ادارہ ہے جو براہِ راست فرد کی انفرادی شناخت کی تعمیر اور اس میں معاشرتی اقدار کو جانچنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔

نئی اقوام کے ادب کا مطالعہ ۴ے

اس مضمون کے تحت دنیا کے نقشے پر ملکی صورتِ حال میں ظاہر ہونے والی اقوام کے ناول اور افسانوں کا مطالعہ کرایا جاتا ہے جس میں افریقہ، مڈل ایسٹ، اور ساؤتھ ایشیا شامل ہیں۔ مغرب کی ادبی اقسام اور زبانی ادبی روایات کے ساتھ کولونیلزم، نسلی تعلق، ادبی اسلوب و مقامی و غیر مقامی زبانوں کے معاملات کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔

بچے اور والدین۔ دنیاوی ادب کے تناظر میں ۵ے

قدیم و جدید انگریزی اور امریکی ادب کی شاخوں میں بچے اور والدین کے تعلق کو پڑھایا جاتا ہے۔ اس موضوع کا مقصد عمری تضادات کے محرک کو زیرِ بحث لانا ہے۔

دنیاوی ادب کے تناظر میں موت اور مابعد موت ۶ے

اس موضوع کے تحت موت مابعد اور نئی زندگی کے متعلق دنیاوی ادب میں پائے جانے والے موضوعات کو مختلف زاویوں سے پڑھایا جاتا ہے۔

فلم کا مطالعہ ۷ے

یہ نصاب، یورپ کے قومی سنیماؤں سے لی گئی مختلف مثالوں کے جامع تجزیے اور فلمی نظریے

اور تنقید نگاری کے وسیع مطالعے کے لیے بنایا گیا ہے۔ ابتدائی فلمی نظریے، قدیم دور میں سنیما کی کشش، اور اہم عصر سنیما کے ظاہر معاہدوں کے متعلق ہے۔

فلمی نظریے اور تنقید پر مشتمل یہ نصاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں بنیادی فلمی نظریات، قدیم دور سے آج تک لوگوں کی سنیما سے دل چسپی کے اسباب اور فنی مراحل کے متعلق ہوگا۔

اس کے ساتھ طالب علم مندرجہ ذیل اختیاری مضامین میں سے دو کا مطالعہ ایک میقات میں کرے گا۔

۱۔ قدیم یورپی سنیما: مختلف مراحل

۲۔ اطالوی سنیما: حقیقت نگاری اور اس کی اقسام

۳۔ برطانوی اور آئرش سنیما: ۱۹۴۵ء سے مختلف مراحل

۴۔ جدید جرمن سنیما سینما: سنیما کا تصور و اسلوب۔

اس کے ساتھ طالب علم ۵۰۰۰ االفاظ پر مشتمل مقالہ سنیما کے تصور و اسلوب پر پیش کرے گا۔

(دنیا کے کئی ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کی معیشت کی بہتری میں فلم انڈسٹری کا بھی نمایاں کردار ہے۔ جب کہ ہمارے ملک میں ہماری فلم انڈسٹری ملکی معیشت کی بہتری میں کوئی خاص کردار نہیں ادا کر رہی، صرف زندہ ہے۔ جس کی ذمے داری جامعات پر عائد ہوتی ہے، جامعات کے نصاب میں صرف ڈرامے پر خصوصی توجہ ہے، اس لیے دنیوی سطح پر پاکستانی ڈراما کامیاب ہے، لیکن فلم کو نہیں پڑھایا جاتا اس لیے یہ انڈسٹری صرف زندہ ہے)

۸۔ ادب کے اہم کردار

اس مضمون میں ادب کے ان اہم کرداروں، مثلاً: عاشق، رقیب، آرٹسٹ، شعبدہ باز وغیرہ کو مختلف زاویوں اور قومی روایات کے آئینے میں پڑھاتے ہوئے نہ صرف ان کا تقابلی جائزہ لے کر فرق واضح کر کے دکھایا جاتا ہے بلکہ یہ فرق کیوں پیدا ہوا؟ اس پس منظر کو بھی طالب علموں پر عیاں کیا جاتا ہے۔ مثلاً: عاشق ملکی سطح پر پشتو، پنجابی، سندھی، بلوچی، کشمیری ادب میں موجود ہے ان میں کیا فرق ہے؟ اور کیوں ہے؟ اسی طرح اس کا دائرہ بڑھاتے ہوئے بین الاقوامی سطح پر، ایشائی، افریقی، یورپی، امریکی عاشق اور عشق میں کیا فرق ہے؟ اور یہ فرق کن مذہبی، ثقافتی یا قومی روایات کے نتیجے میں پیدا ہوا اس کو پڑھایا جاتا ہے۔

۹۔ تہذیبی تصادم

ادب میں مختلف تہذیبوں کے ٹکراؤ کی چھان بین ہوتی ہے۔ جیسے فن، فلم، موسیقی اور دیگر

ذرائع (خانہ بدوشی ،سفر ،استعماریت ،مذہبی تبلیغ ،پرنٹ والیکٹرانک میڈیا) تہذیبی رابطوں کا سبب بنتے ہیں۔

اس کے تحت تہذیبی اداروں کی تبدیلی ،تہذیبی تغیر وتبدل کا عکس ،فن وتہذیب کے عالمی پھیلاؤ اورمشترکہ تہذیبی نمونوں کوواضح کیا جاتا ہے۔

بچوں اورنو جوانوں کے ادب میں ماں کی شخصیت: ۱۰

بچوں اورنو جوانوں کا ادب زیادہ تر لکھا جاتا ہے،اونچی آواز میں گھر میں پڑھا بھی جاتا ہے، اوراسکولوں میں خواتین اساتذہ کے ذریعے پڑھایا بھی جاتا ہے، کیا ہم اس کے ذریعے مادرسراہی کلچر کو فروغ دے رہے ہیں؟ ماں کے کردار کو پرنٹنگ پریس کے دور سے لے کر موجودہ الیکٹرانک دور تک کس طرح پیش کیا گیا اور کیا جارہا ہے، نصابی کتب میں ماں اور مادرانہ شفقت کو کس طرح دکھایا جارہا ہے،نو جوان قاریوں کو کس طرح کے مادرانہ نظریات دیے جارہے ہیں وغیرہ۔اس مضمون کا بنیادی ماخذ نرسری، پرائمری میں پڑھائی جانے والی نظموں ،فیئری ٹیلس ،بچوں کو دی جانے والی لوریاں، تصاویری کتب، نصابی کتب اورنو جوانوں کے ناول ہیں۔

طفلی ادب اور فلم ۱۱

انگلینڈ اور امریکا میں ۱۹ویں صدی میں جب بچوں کی پسندیدہ کتب کو تھیٹر اور فلم کے لیے استعمال کیا گیا تو اس انداز کو شہرت حاصل ہوئی اور شہرت یافتہ اسٹیج پلے اور فلمیں سامنے آئیں۔اس مضمون کے تحت یہ واضح کیا جاتا ہے کہ جب بچوں کے ادب کو بڑی اسکرین پر لایا گیا تو ہم نے معاشی وسماجی واخلاقی اعتبار سے کیا کھویا اور کیا پایا؟

{ مندرجہ بالا دو نصاب (ا۔بچوں اورنو جوانوں کے ادب میں ماں کی شخصیت ۲۔ طفلی ادب اور فلم) میں نے ھالینس یونیورسٹی کے نصاب سے منتخب کیے ہیں یہ بھی واضح رہے کہ اس یونیورسٹی میں صرف بچوں کے ادب پر مکمل گریجویشن ہوتی ہے }

خصوصی مطالعہ تذکیر وتانیث ۱۲

مختلف زبانوں کے ادب میں موجود جنسیات اور جنسی کشش کو مختلف معاشرتی اقدار کے تقابلی جائزے کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔

نسل پسندی اور ادب ۱۳

اس موضوع کے تحت نسلی ادب کیا ہے؟ نسلی تحریریں کس طرح غیر نسلی تحریروں سے مختلف ہوتی ہیں؟ یہ ایسا ہے یا کوئی دوسری بات ہے۔ اگر نسلیت پرستی کو تجرباتی پس منظر میں قبول کیا جا رہا ہے تو وہ ادب پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے، اور وہ ادب نسلیت پسند قاریوں پر کس طرح اثر ڈالتا ہے۔ (مقالات، نسلی ادب پر مشتمل فلمیں اور تہذیبی سیاست) نسلی ادب، کس طرح سماجی روابط، تاریخی، سیاسی و ذاتی معاملات کی نمائندگی کرتا ہے، جیسے موضوعات کو زیرِ بحث لا کر وضاحت کی جاتی ہے۔

تقابلی ادب، ادب اور سیاست و سیاسی ناول ۱۴

سیاسی نظریات اور عملی سیاست کو ادب میں کس طرح پیش کیا گیا ہے؟ انیسویں صدی کے وسط تک لکھے گئے سیاسی ناولوں کے مطالعے سے نتائج برآمد کیے جائیں گے۔ اس سلسلے میں ادب کے آئینے میں جن سیاسی اجزا کا مفصل جائزہ لیا جائے گا اس میں اعلیٰ سطحی سیاست، دانش وروں کی جلاوطنی،، طبقاتی سیاست، نسلی سیاست، ناکام انقلاب اور متبادل تاریخ شامل ہیں۔

الحاصل یہ ہے کہ آج کے اس تیز رفتار اور کمرشلائیز زمانے میں ہر منصوبے اور مضمون کو قبول کرنے سے پہلے ایک تو معیشت پر ہونے والے اس کے براہِ راست اثرات دیکھے جا رہے ہیں اور دوسری طرف دیگر سائنسی و غیر سائنسی مضامین کو سمجھنے اور ان کو ترقی دلانے میں، ان کے عمل دخل کی بنیاد پر، ان کو اہمیت دی جا رہی ہے، اس لیے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں ادب کی Leading Roll والی حیثیت پس منظر سے نکل کر پیش منظر پر آئے تو ہمیں تمام تعلیمی اداروں میں ادب کو اپنے روایتی انداز کے ساتھ ساتھ باقاعدہ تقابلی انداز میں پڑھانے کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں ادباء و شعرا کو پریشان کیے بغیر ادب و زبان سے وابستہ تمام سرکاری و غیر سرکاری تعلیمی اداروں، محققین، ادب دوست و جدید رجحانات کو پسند کرنے والے لوگوں کو آگے آ کر اس ڈگر پر باقاعدہ کام کر کے، ادب میں سے، ہر شعبۂ زندگی کے لیے اس کی ضرورت کے مطابق، مواد فراہم کرنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ اس وقت عالم گیریت کے اس دور میں ادب کا معاشرے میں رہبر والا کردار بھرپور انداز میں پیش کرنے کے تمام رجحانات کی یہی بنیاد ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ہم اور ہماری نفسیات، مرتب و مترجم مرتضیٰ شفیع، کراچی، ایجوکیشنل بک ڈپو، سنہ ندارد، ص ۳۱۔

۲۔ کورس نمبر CLIT 210، نصاب برائے کالج آف آرٹس اینڈ سائنس کمپریٹو لٹریچر، یونیورسٹی آف واشنگٹن۔

۳۔ کورس نمبر CLIT 211، نصاب برائے کالج آف آرٹس اینڈ سائنس کمپریٹو لٹریچر، یونیورسٹی آف واشنگٹن۔

۴۔ کورس نمبر CLIT 323، ایضاً

۵۔ کورس نمبر CLIT 350، ایضاً

۶۔ کورس نمبر CLIT 352، ایضاً

۷۔ کورس برائے ایم ایس سی ڈگری اور برائے ڈپلوما، دی یونیورسٹی آف ایڈن برگ۔

۸۔ کورس نمبر C145 کورسز برائے انڈر گریجویٹ، شعبۂ تقابلی ادب، انڈیانا یونیورسٹی بلومنگٹن۔

۹۔ کورس نمبر C262 کورسز برائے انڈر گریجویٹ، شعبۂ تقابلی ادب، انڈیانا یونیورسٹی بلومنگٹن۔

۱۰۔ کورس نمبر ENG 550 کو ڈگر یجویٹس پروگرام ھالینس یونیورسٹی۔

۱۱۔ کورس نمبر ENG 550 خصوصی مطالعہ (جب بچپنا ہالی ووڈ کی طرف روانہ ہوا) ھالینس یونیورسٹی۔

۱۲۔ کورس نمبر ENG 450 451 شعبۂ ادب، البامہ اسٹیٹ یونیورسٹی۔

۱۳۔ کورس نمبر 24Q شعبۂ ادب اسٹینفورڈ یونیورسٹی۔

۱۴۔ کورس نمبر S3721D تقابلی ادب، کولمبیا یونیورسٹی نیو یارک۔

عتیق احمد جیلانی

ناصؔر کاظمی کی غزلوں کا اشاعتی وتدوینی گوشوارہ

(''دیوان'' کی روشنی میں)

ناصؔر کاظمی (۱۹۲۳ء-۱۹۷۲ء) کے کلام کی کلیات اور اس سے پہلے چھے مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ اشاعت کی زمانی ترتیب کچھ یوں ہے۔

بَرگِ نے: ۱۹۵۲ء۔ دیوان: ۱۹۷۲ء۔ پہلی بارش: ۱۹۷۵ء۔ نشاطِ خواب: ۱۹۷۷ء۔

سُر کی چھایا: ۱۹۸۱ء۔ خشک چشمے کے کنارے، ۱۹۹۰ء۔ کلیاتِ ناصر: ۱۹۹۲ء۔

''کلیات'' کے آخر میں ''غیر مطبوعہ'' کلام کے عنوان سے ۱۲ غیر مدوّن غزلیں اور ۳۳ متفرق اشعار دیے گئے ہیں۔ اس سے پہلے عبدالحمید، مالک کاروانِ ادب، لاہور، اپنے ایک مضمون (مشمولہ ''ہجر کی رات کا ستارہ''، مرتبہ: احمد مشتاق) میں ناصؔر کی ایک غیر مطبوعہ غزل اور چند متفرق اشعار کی نشان دہی کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر سید حسن عباس رضوی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں بھی انھی کے حوالے سے مذکورہ اشعار نقل کیے ہیں۔ مگر رسائل میں موجود غیر مدوّن کلام کا تذکرہ شاید ان کے دائرۂ کار سے باہر تھا یا کوئی مصلحت مانع تھی۔ ناصؔر کاظمی اور ان کی شاعری سے دل چسپی کے سبب میں نے گذشتہ بیس پچیس سال کے دوران اُردو رسائل سے ان کا بہت سا غیر مدون کلام جمع کیا ہے۔ اردو رسائل میں بکھرا ہوا یہ کلام ناصؔر کے تمام مجموعوں کا احاطہ کرتا ہے۔ مکمل جائزہ ان شاء اللہ جلد کتابی صورت میں سامنے لایا جائے گا۔ فی الوقت کچھ غزلوں کے تجزیے پر مشتمل یہ مضمون بطورِ تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

اس مضمون کے پہلے حصے میں ۱۹۵۲ء کے بعد کی سات غیر مدوّن غزلیں دی گئی ہیں جنھیں ترتیبِ زمانی کے لحاظ سے ''دیوان'' میں ہونا چاہیے تھا۔

دوسرے حصے میں پچاس غزلوں کا اشاعتی وتدوینی گوشوارہ درج کیا گیا ہے۔ اس جائزے میں ناصؔر کا بہت سا غیر مدوّن کلام سامنے لانے کے ساتھ ساتھ متنی تغیرات کی نشان دہی بھی کی گئی ہے، جس سے شاعر کے فکری اور فنی ارتقاء کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس جائزے کا ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہے کہ ''دیوان'' میں جن غزلوں کا سنہ اشاعت درج نہیں، متعلقہ رسالے کے سنہ اشاعت سے ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

غیر مدوّن کلام

ذیل میں ناصر کاظمی کی چند غزلیں پیش کی جا رہی ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ تمام غزلیں ''برگِ نے'' کی اشاعت (۱۹۵۲ء) کے بعد کی ہیں مگر انھیں ''دیوان'' کی تدوین کے دوران نظر انداز کر دیا گیا اور پھر ''کلیاتِ ناصر کاظمی'' (۱۹۹۲ء) کے آخر میں دیے گئے اضافی کلام میں بھی جگہ نہ پا سکیں۔

۱۔ کلام مشمولہ ''ادبِ لطیف''، لاہور، سال نامہ ۱۹۵۳ء۔

دم گھٹنے لگا ہے وضعِ غم سے
پھر زور سے قہقہہ لگاؤ
ہستی کی بساط اُلٹ نہ جائے
اُمید کی چال میں نہ آؤ
میں درد کے دن گزار لوں گا
تم جشنِ شبِ طرب مناؤ
کچھ سہل نہیں ہمارا ملنا
تابِ غمِ ہجر ہے تو آؤ

۲۔ غزل مشمولہ ''ادبِ لطیف''، لاہور، سال نامہ مارچ ۱۹۵۵ء۔

بلا سے گر نہیں گلشن ہمارا
ہمارے ساتھ ہے شیون ہمارا
ابھی کچھ رنگِ پیچاں ہیں رگوں میں
ابھی خالی نہیں دامن ہمارا
حیا آتی ہے جس کو آنکھ اٹھاتے
اسی کے دل میں ہے مسکن ہمارا
شکایت کیا کریں ہم دوستوں کی
ہمارا دوست ہے دشمن ہمارا
نگارانِ چمن کا مُنھ نہ دیکھے
صبا سن لے اگر شیون ہمارا

۳۔ غزل مشمولہ ''ماہِ نو''کراچی،نومبر ۱۹۵۵ء۔

دشت سے چل کے تا نگر پہنچا
اب کے سیلاب اپنے گھر پہنچا
راستے گنگ منزلیں سنسان
کیا خبر قافلہ کدھر پہنچا
دُور ہُوں کارواں سے غربت میں
اے صبا تُو ہی اب خبر پہنچا
زندگی کے عتاب بھول گئے
دُکھ عزیزوں سے اس قدر پہنچا
دردِ جاں لادوا نہ تھا لیکن
چارہ گر دیر سے اِدھر پہنچا
دیکھ نیرنگِ گردشِ تقدیر
کِس نے بویا کسے ثمر پہنچا
رات کِس دل جلے نے آہ بھری
غُلغلہ آسمان پر پہنچا!
اب تو جاگو حویلیوں والو!
اب تو سیلاب تا کمر پہنچا
دھوپ ٹھنڈی ہوئی نہ تھی ناصر
کہ ڈبونے کو ابرِ تر پہنچا

۴۔ غزل مشمولہ ''ماہِ نو''،کراچی مئی ۱۹۵۶ء۔

کلیوں نے پھر کھولے دُوار
کنج کنج پڑے رس کی پھوار
جنگل جاگے ہوا چلی
چونک پڑی ہرنوں کی ڈار

پتوں کی اندھیاری میں
سو گئی چڑیوں کی چہکار
پنکھ لگا کر پریوں کے
اُڑ گئی پھولوں کی مہکار
آدھی رات جگاتی ہے
بیتے لمحوں کی گنجار
ساجن کا سندیس آیا
گوری چُھپ کے کرے سنگار
رس کی بوندیں شور کریں
چھم چھم ناچے سندر نار

----

(۵) غزل مشمولہ ''جائزہ'' کراچی، سال نامہ ۱۹۶۰ء۔

طے رہِ عشق کو بے خوف و خطر ہم نے کیا
پہلے اس دشت میں آغازِ سفر ہم نے کیا
جی جلانے میں بھی اک طرفہ ہنر ہم نے کیا
ایک آواز سے پتھر کو شرر ہم نے کیا
یوں تو پھرتی ہے ترے شہر میں اک خلقِ خدا
آشنایانہ ترے دل سے گزر ہم نے کیا
اس قدر درپئے آزار نہ ہو اے گُل چیں
باغ جل جائے گا سب، نالہ اگر ہم نے کیا
رہ نماؤں نے کڑے دام بچھائے ہر سُو
اک نئی راہ کا جب عزمِ سفر ہم نے کیا
یوں لرزتا نظر آیا دلِ امکاں ناصرؔ
آج کچھ اپنے ارادوں سے حذر ہم نے کیا

۶۔ غزل مشمولہ ''فنون'' لاہور، فروری، مارچ ۱۹۶۶ء۔

نوید فتح لیے سالِ نیک فال آیا
ہزار سال فدا جس پہ ہوں وہ سال آیا
اُگل دیے ہیں زمیں نے دفینے برسوں کے
یہ آج گردشِ دوراں کو کیا خیال آیا
نئے گلاب کی لو سے دمک اٹھی ہے فضا
نئی امنگ لیے موسمِ وصال آیا
ترس گئی تھی نظر جس کو ایک مدّت سے
دیارِ دل میں وہی ماہِ لازوال آیا
دلِ حزیں اُسے دیکھا ہے آج عمر کے بعد
تجھے قسم ہے جو لب پر کوئی سوال آیا
کدھر سے آیا، کدھر کو گیا، کسے پوچھوں
کچھ اس ادا سے نظر میں وہ خوش خصال آیا
تماشا گاہِ طلوع و غروب میں ناصرؔ
اسے غرور نہ آیا جسے کمال آیا

۷۔ غزل مشمولہ ''اوراق''، شمارہ نمبر ۴، شمارۂ خاص، لاہور، ۱۹۶۶ء۔

درجِ ذیل غزل کا مطلع اور شعر نمبر ۶، ''کلیات'' کے آخر میں موجود ہے مگر باقی سات اشعار غیر مدوّن ہیں۔

حُسن اور حسن کا احساس بھی کیا ہوتا ہے
جب بھی دیکھو اسے وہ شخص نیا ہوتا ہے
ابتدا میں تو بہت خوب گزرتی ہے مگر
اے محبت ترا انجام بُرا ہوتا ہے
بار بار اُس سے مرا ذکر نہ کرنا یارو!
ایسی باتوں سے تو وہ اور خفا ہوتا ہے

تہِ خاکسترِ گُل رقصِ شرر تو ہے مگر
حاصلِ رقصِ شرر دیکھیے کیا ہوتا ہے

سر بہ کف ہم بھی ہیں وہ تیغ بھی ہے تشنہء خوں
دیکھیں اب کون یہاں عہدہ برآ ہوتا ہے

چھیڑ جاتی ہے صبا روز ہمارے دل کو
روز اس شہر میں اک حشر بپا ہوتا ہے

تنگ ہیں ہم تری تقریر سے اے واعظِ شہر!
وہی سنتے ہیں جو پہلے بھی سنا ہوتا ہے

ہم تو یوں خوش ہیں کہ جب بھی شبِ غم آتی ہے
اپنا دامن بھی ستاروں سے بھرا ہوتا ہے

ہم سُبو گھر سے نکلتے ہی نہیں اب ناصر
مے کدہ رات گئے تک تو کُھلا ہوتا ہے

غزلیات کا اشاعتی و تدوینی گوشوارہ

(۱) غزل: آرائشِ خیال بھی ہو دل کُشا بھی ہو

تعدادِ اشعار: ۱۱

۱۔ جریدہ: ''سویرا'' لاہور، شمارہ نمبر ۱۹۔۲۰۔۲۱۔

تعدادِ اشعار: ۱۳

''سویرا'' میں اضافی اشعار: ۲

کیوں چیختی ہیں تپتی دوپہروں میں قُمریاں
وہ جانتا ہے جس کا کبھی دل دُکھا بھی ہو

پھرتے ہیں کیسے کیسے خیالات ذہن میں
لکھوں، اگر زبانِ قلم آشنا بھی ہو

تغیر الفاظ:

دیوان	:	آرائشِ خیال بھی ہو، دل کُشا بھی ہو
سویرا	:	آرائشِ خیال بھی ہو، جاں فزا بھی ہو
دیوان	:	ٹوٹے کبھی تو خوابِ شب و روز کا طلسم
سویرا	:	ٹوٹے کبھی تو حسنِ شب و روز کا طلسم
دیوان	:	رہزن کا خوف بھی نہ رہے در کھلا بھی ہو
سویرا	:	رہزن کا خوف بھی نہ ہو در کُھلا بھی ہو

(سہوِ کتابت)

۲۔جریدہ : ''فنون'' لاہور، جدید غزل نمبر، جلد دوم، جنوری ۱۹۶۹ء۔

تعداد اشعار: ۱۲

فنون میں اضافی شعر:

پھرتے ہیں کیسے کیسے۔۔۔۔۔۔ [مذکورہ بالا]

تغیر الفاظ :

دیوان	:	ٹوٹے کبھی تو خوابِ، شب و روز کا طلسم
فنون	:	ٹوٹے کبھی تو حُسنِ شب و روز کا طلسم

---

(۲) غزل : نیتِ شوق بھر نہ جائے کہیں

تعداد اشعار : ۶

''جریدہ'' : ''ہم قلم'' کراچی، نومبر ۱۹۶۱ء۔

تعداد اشعار : ۷

''ہم قلم'' میں اضافی شعر: ایک

دل سے ہر وقت کوئی کہتا ہے
غم کا احساس مر نہ جائے کہیں

تغیر الفاظ:

دیوان:	تو بھی دل سے اتر نہ جائے کہیں
ہم قلم:	تو بھی جی سے اتر نہ جائے کہیں

دیوان: آج دیکھا ہے تجھ کو دیر کے بعد
''ہم قلم'': آج دیکھا ہے تجھ کو برسوں بعد

---

(۳) غزل : ممکن نہیں متاعِ سخن مجھ سے چھین لے
تعدادِ اشعار: ۵
جریدہ : ''نقوش''، لاہور، شمارہ ۵۵۔۵۶، مارچ ۱۹۵۶ء۔
تعداد اشعار : ۷
نقوش میں اضافی اشعار: ۲

یارب غرورِ دردِ غریبی کا واسطہ
میں بے وطن ہوں یادِ وطن مجھے سے چھین لے
یا برگ و ساز دے مرے شایانِ آرزو
یا میری زندگی کا چلن مجھ سے چھین لے

تغیر الفاظ:

دیوان: یہ بے فضا علاقۂ تن مجھ سے چھین لے
نقوش: بے کار ہے علاقۂ تن مجھ سے چھین لے

---

(۴) غزل: مسلسل بے کلی دل کو رہی ہے!
تعدادِ اشعار: ۵
جریدہ : ''نیا دور'' کراچی، شمارہ ۳۔۴
تعداد اشعار: ۵
تغیر الفاظ :

دیوان: چلے دل سے امیدوں کے مُسافر
نیا دور: چلے دل سے امیدوں کے براتی
[''براتی'' کے مقابلے میں لفظ ''مسافر'' کیسا معنی خیز اور پُر اثر ہے]

---

(۵) غزل : سناٹا ہے کوئی بھولی کہانی

تعداد : ۱۲

۱۔ جریدہ : ''سویرا'' لاہور، شمارہ ۱۵، ۱۶۔

تعدادِ اشعار : ۱۲

سویرا میں اضافی شعر : ایک

سرائے دہر سے غافل نہ گزرو
یہاں بھٹکے ہیں کتنے کاروانی

دیوان میں اضافی شعر : ایک

تصور نے اسے دیکھا ہے اکثر
خرد کہتی ہے جس کو لامکانی

تغیر الفاظ:

دیوان: مہکتے میٹھے دریاؤں کا پانی
سویرا: ہمکتے میٹھے دریاؤں کا پانی
دیوان: جسے روئے گی صدیوں شادمانی
سویرا: جسے روئے گی برسوں شادمانی

۲۔ جریدہ : ''فنون''، شمارہ: جدید غزل نمبر، جلد دوم، جنوری ۱۹۶۹ء۔

تعدادِ اشعار : ۱۲

تغیر الفاظ :

دیوان: تصور نے اسے دیکھا ہے اکثر
فنون: تحیّر نے اسے دیکھا ہے اکثر

---

(۶) غزل : رہ نوردِ بیابانِ غم صبر کر صبر کر

تعدادِ اشعار: ۱۲

۱۔ جریدہ : ''نیا دور'' کراچی، شمارہ ۱۱، ۱۲۔ ۵۸ء، ۱۹۵۷ء۔

تعدادِ اشعار: ۱۳

نیادور میں اضافی شعر: ایک

بستیوں میں اندھیرا سہی، غم کا ڈیرا سہی
پھر نئی صبح لے گی جنم صبر کر صبر کر

۲۔ جریدہ : فنون، شمارہ: جدید غزل نمبر، ۱۹۶۹ء۔

تعدادِ اشعار: ۱۳

فنون میں اضافی شعر: ایک

بستیوں میں ------------

(مذکورہ بالا)

---

(۷) غزل: دکھ کی لہر نے چھیڑا ہوگا

تعدادِ اشعار: ۱۶

جریدہ : ''فنون'' لاہور، اپریل ۱۹۶۳ء۔

تعدادِ اشعار: ۲۴

فنون میں اضافی اشعار: ۸

زرد کھجوروں کے جنگل میں
نور کا دریا بہتا ہوگا

لمبی بل کھاتی گلیوں میں
اک سایہ سا پھرتا ہوگا

بال جھٹکتے آنکھیں ملتے
گھر کا دریچہ کھولا ہوگا

دروازے پر دستک سُن کر
تُو کس ناز سے پہنچا ہوگا

میں نہ سہی کوئی مجھ سا پاگل
تجھ کو بلانے آیا ہوگا

دھیان میں تجھ کو دیکھ رہا ہوں
تُو اب گھر سے نکلا ہوگا
بستی کے ملنے والوں سے
کیا کیا باتیں کرتا ہوگا
میں نے جنھیں کبھی مُنھ نہ لگایا
تُو اب اُن سے ملتا ہوگا

تغیرِ الفاظ:

دیوان:	شہر	کے	خالی	اسٹیشن	پر
فنون:	شہر	کے	سُونے	اسٹیشن	پر
دیوان:	پھول	سا	مکھڑا	دھویا	ہوگا
فنون:	پھول	سا	چہرہ	دھویا	ہوگا

----

(۸)غزل: گل نہیں، مے نہیں، پیالہ نہیں

تعدادِ اشعار: ۱۰

جریدہ: ''سویرا'' لاہور، شمارہ ۱۵، ۱۶۔

تعداد اشعار: ۱۳

سویرا میں اضافی اشعار: ۳

ہر مقامِ نظر یہ کہتا ہے
میں تری آرزو کا رمنا نہیں

خود بخود بج رہے ہیں دروازے
گھر سے بڑھ کر کوئی خرابہ نہیں

آپ اپنی دلیل ہے ہر شے
زندگی منطق و قیافہ نہیں

تغیرِ الفاظ:

دیوان: ہوش کی تلخیاں مٹیں کیسے

سویرا: ہوش کی تلخیاں مٹائے کون

---

(۹) غزل: ان سہمے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے

تعدادِ اشعار: ۹

۱۔ جریدہ: ''لیل و نہار'' لاہور، ۱۶ اگست ۱۹۵۹ء

تعدادِ اشعار: ۹

۲۔ جریدہ: ''فنون'' لاہور، شمارہ: جدید غزل نمبر، جلد دوم، جنوری ۱۹۶۹ء۔

تعدادِ اشعار: ۸

دیوان میں اضافی شعر: ایک

جب صبح کو چڑیاں باری باری بولتی ہیں
کوئی نامانوس اداس نوا کچھ کہتی ہے

تغیرِ الفاظ :

دیوان: اور دُور کہیں کوئل کی صدا کچھ کہتی ہے

فنون: اور دُور کہیں کوئل کی ندا کچھ کہتی ہے

---

(۱۰) غزل: گلی گلی مری یاد بچھی ہے پیارے رستہ دیکھ کے چل

تعدادِ اشعار: ۵

جریدہ: ''فنون'' لاہور، اکتوبر ۱۹۶۳ء

فنون میں اضافی شعر: ایک

ایک یہ وقت کہ تُو نے مجھ کو دیکھتے ہی مُنھ پھیر لیا
ایک وہ دن جب تُو نے میرے پاؤں میں رکھا تھا آنچل

تغیرِ الفاظ:

دیوان: میں وہی تیرا ہم راہی ہوں ساتھ مرے چلنا ہوتو چل

فنون: میں وہی تیرا ہم راہی ہوں ساتھ مرے چلنا ہو چل

----

(۱۱) غزل: جب ذرا تیز ہوا ہوتی ہے

تعدادِ اشعار: ۱۳

جریدہ: ''سویرا'' لاہور، شمارہ نمبر ۱۳، ۱۴۔

تعدادِ اشعار: ۱۴

سویرا میں اضافی اشعار: ۳

چونک پڑتی ہے فضا بھی جس سے
وہ خموشی کی ندا ہوتی ہے
مشعلِ شوق اگر ساتھ رہے
راہ خود راہ نُما ہوتی ہے
آگ برساتا ہے صحرائے خیال
گرم جب ریگِ انا ہوتی ہے

دیوان میں اضافی اشعار: ۲

دل کا یہ حال ہُوا تیرے بعد
جیسے ویران سرا ہوتی ہے
مُنھ اندھیرے کبھی اٹھ کر دیکھو
کیا تر و تازہ ہُوا ہوتی ہے

----

(۱۲) غزل : شہر سُنسان ہے کدھر جائیں

تعدادِ اشعار : ۵

جریدہ : ''نقوش'' لاہور، شمارہ ۳۳۔۳۴، اگست ستمبر ۱۹۵۳ء۔

تعدادِ اشعار : ۶

نقوش میں اضافی اشعار: ۲

قافلے دور بستیاں اوجھل
بول اے بے کسی کدھر جائیں
یوں پریشاں ہوئیں تری یادیں
جیسے اوراقِ گل بکھر جائیں

دیوان میں اضافی شعر : ایک

یوں ترے دھیان سے لرزتا ہوں
جیسے پتے ہوا سے ڈر جائیں

تغیرِالفاظ:

دیوان: چھب دکھاتے ہی جو گزر جائیں
نقوش: پل جھپکتے ہی جو گزر جائیں

---

(۱۳)غزل : دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی

تعدادِاشعار: ۹

ا۔جریدہ: ''آہنگ'' کراچی، ۷مئی ۱۹۶۵ء

تعدادِاشعار: ۱۱

آہنگ میں اضافی اشعار: ۲

کچھ تو نازک مزاج ہیں ہم بھی
اور کچھ چوٹ بھی نئی ہے ابھی
جی جلانے دے ہم نفس کہ مجھے
فرصتِ نالہء شبی ہے ابھی

۲۔ جریدہ: ''فنون'' لاہور، ''جدید غزل نمبر''، جنوری ۱۹۶۹ء

[محولہ بالا ''آہنگ'' مئی ۶۵ء کے مطابق]

(۱۴)غزل: دفعتہً دل میں کسی یاد نے لی انگڑائی

تعدادِ اشعار: ۷

ا۔جریدہ : ''صحیفہ'' لاہور،شمارہ:۱۶،جولائی ۱۹۶۱ء۔

تعدادِ اشعار: ۷

صحیفہ میں اضافی شعر: ایک

یہ تو سچ ہے کہ تمھیں مجھ سے کوئی کام نہیں
یہ بھی سچ ہے کہ مقدر ہے مرا تنہائی

دیوان میں اضافی شعر : ایک

یوں تو ملنے کو وہ ہر روز ہی ملتا ہے مگر
دیکھ کر آج اسے آنکھ بہت للچائی

تغیرالفاظ:

دیوان: وہ تو کہیے کہ اچانک ہی تری یاد آئی
صحیفہ: وہ تو کہیے کہ تری یاد اچانک آئی

۲۔ جریدہ:فنون،شمارہ: جدید غزل نمبر،جنوری ۱۹۶۹ء۔

تعدادِ اشعار: ۶

فنون میں اضافی شعر: ایک

بس یونہی دل کو توقع سی ہے تجھ سے ورنہ
جانتا ہوں کہ مقدر ہے مرا تنہائی

دیوان میں اضافی شعر: ایک

رات بھر جاگتے رہتے ہو بھلا کیوں ناصؔر
تم نے یہ دولتِ بیدار کہاں سے پائی

----

(۱۵)غزل: سرِ مقتل بھی صدا دی ہم نے

تعدادِ اشعار: ۸

جریدہ : ''نقوش'' لاہور،شمارہ۲۹۔۳۰،فروری مارچ ۱۹۵۳ء۔

تعدادِ اشعار : ۹

نقوش میں اضافی شعر : ایک

شہر کے دکھ بھرے اندھیاروں میں
عشق کی شمع جلا دی ہم نے

تغیرالفاظ:

دیوان: آتشِ غم کے شرارے چُن کر
نقوش: دلِ پُرخوں کے شرارے چُن کر

----

(۱۶)غزل: تو اسیرِ بزم ہے ہم سخن تجھے ذوقِ نالہء نے نہیں

تعدادِ اشعار: ۷

جریدہ: ''نیادور'' کراچی، شمارہ: ۱۳، ۱۴۔

تعدادِ اشعار: ۷

تغیرالفاظ:

دیوان: جسے سُن کے روح مہک اٹھے جسے پی کے درد چہک اٹھے
نیادور: جسے سُن کے روح مہک اٹھے جسے پی کے درد چمک اٹھے
دیوان: ترے ساز میں وہ صدا نہیں، ترے مے کدے میں وہ مے نہیں
نیادور: کسی ساز میں وہ صدا نہیں، کسی مے کدے میں وہ مے نہیں
دیوان: کہاں اب وہ موسمِ رنگ و بو کہ رگوں میں بول اٹھے لہو
نیادور: کہاں اب وہ موسمِ آرزو کہ رگوں میں بول اٹھے لہو

----

(۱۷)غزل: آج تو بے سبب اداس ہے جی

تعدادِ اشعار : ۹

جریدہ : ''سویرا'' لاہور، (۳۱)

تعدادِ اشعار : ۱۱

سویرا میں اضافی اشعار : ۲

بھری دُنیا میں کس سے بات کروں
اپنا تو ہم سخن ہے ایک وہی
میں بھی اب میں نہیں محبت میں
اب تو وہ بھی ہے جیسے اور کوئی

تغیرِ الفاظ:

دیوان: وہیں پھرتا ہوں میں بھی خاک بہ سر
سویرا: وہاں پھرتا ہوں میں بھی خاک بہ سر
دیوان: ہم نشیں کیا کہوں کہ وہ کیا ہے
سویرا: ہم نشیں کیا کہوں وہ کیسا ہے
دیوان: ایک دم اس کا ہاتھ چھوڑ دیا
جانے کیا بات درمیاں آئی
سویرا: ایک دم اس کا ہاتھ چھوڑ دیا
وہ مرے ساتھ چل رہا تھا ابھی

---

(۱۸)غزل: پھر نئی فصل کے عنواں چمکے

تعدادِ اشعار: ۵

جریدہ : ''ماہِ نو'' کراچی، دسمبر ۱۹۵۳ء۔

تعدادِ اشعار: ۱۳

ماہِ نو میں اضافی اشعار: ۸

آج پھر شہرِ خزاں کی جانب
کاروانِ گل و ریحاں چمکے
وہ ترشح ہے کہ ہر گوشے میں
زندگی کے سروساماں چمکے
اے ہوا چل کہ نئی رت آئی
جاگ اے دل کہ شبستاں چمکے

اب نہ چیخیں گی اندھیری راتیں
چاند نکلا چمنستاں چمکے
اب نہ روئیں گے ترے ہجر نصیب
وہ ستارے سرِ مژگاں چمکے
دل میں جلتی تو ہے اک شمعِ طرب
دیکھیں کب تک تہِ داماں چمکے
کیا کوئی آبلہ پا آتا ہے؟
آج کیوں خارِ بیاباں چمکے
کس کی فریاد افق تاب ہوئی
آج کیوں روزنِ زنداں چمکے

---

(۱۹)غزل: بیتے لمحوں کی جھانجن

تعدادِ اشعار: ۷

جریدہ : ''سیپ''کراچی،شمارہ:۲

تعدادِ اشعار: ۸

سیپ میں اضافی شعر: ایک

رُوٹھے سانول من موہن
تجھ بن دل ہے نرجن بَن

تغیرِ الفاظ :

دیوان: ساری رات جگاتی ہے
بیتے لمحوں کی جھانجن

سیپ: سونے نہیں دیتی مجھ کو
تیری یادوں کی جھانجن

دیوان: لال کھجوروں نے پہنے
سیپ: سبز درختوں نے پہنے

---

(۲۰) غزل: چراغ بَن کے وہی جھلملائے شامِ فراق

تعدادِ اشعار: ۷

ا۔ جریدہ : ''نیا دور'' کراچی، شمارہ ۵۳، ۵۴۔

تعدادِ اشعار: ۷

تغیر الفاظ :

دیوان:	کدھر چلے گئے وہ ہم نوائے شامِ فراق
نیادور:	کہاں چلے گئے وہ ہم نوائے شامِ فراق
دیوان:	بچھی ہے آگ سی کیا زیرِ پائے شامِ فراق
نیادور:	بجھی ہے آگ سی کیا زیرِ پائے شامِ فراق
دیوان:	بجھی بجھی سی ہے کیوں چاندکی ضیاء ناصؔر
نیادور:	اُڑی اُڑی سی ہے کیوں چاند کی ضیاء ناصؔر

۲۔ جریدہ: ''فنون''، لاہور، فروری ۷۰ء۔

تعدادِ اشعار: ۷

تغیر الفاظ :

(محولہ بالا تغیرات نمبر ا اور نمبر ۳ کے مطابق)

---

(۲۱) غزل: یوں ترے حُسن کی تصویر غزل میں آئے

تعدادِ اشعار: ۶

ا۔ جریدہ : ''فنون''، لاہور، جولائی اگست ۱۹۶۶ء۔

تعدادِ اشعار: ۱۲

فنون میں زائد اشعار: ۶

نہیں آتی ہے تو راتوں ہمیں آتی نہیں نیند
اور اگر آنے پہ آ جائے تو پَل میں آئے

میرے حصّے کا بھی اک دور چلے آخرِ شب
اے فلک! کچھ تو مکافاتِ عمل میں آئے

کارِ دنیا میں تو ہم فرصتِ غم سے بھی گئے
چین سے ہیں جوتری زلف کے بل میں آئے
جن کی شیرینیِ گفتار پہ تھا زُعم ہمیں
آج وہ بھی لیے شمشیر بغل میں آئے
اٹھ کے اک بار الٹ دوں غمِ دنیا کی بساط
اتنی طاقت تو مرے بازوئے شَل میں آئے
نام چلتا ہے زمانے میں انھی کا ناصرؔ!
کام جو عُقدۂ حالات کے حل میں آئے

۲۔ جریدہ: ''اوراق''، لاہور، شمارہ: ۳، ۱۹۶۶ء۔

تعدادِ اشعار: ۱۰

اوراق میں اضافی اشعار: ۵

(درجِ ذیل شعر، اوراق میں نہیں ہے جب کہ ''فنون'' میں شائع شدہ محولہ بالا پانچ شعر موجود ہیں۔)

جن کی شیرینیِ گفتار پہ تھا زعم ہمیں
آج وہ بھی لیے شمشیر بغل میں آئے

دیوان میں اضافی شعر: ایک

زندگی جن کے تصور سے جِلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دامِ اجل میں آئے

تغیر الفاظ:

دیوان: ہر قدم دست و گریباں ہے یہاں خیر سے شر
اوراق: ہر نفس دست و گریباں ہے یہاں خیر سے شر

----

(۲۲) غزل: کسی کا درد ہو دل بے قرار اپنا ہے

تعدادِ اشعار: ۹

جریدہ: ''سویرا'' لاہور، شمارہ: ۲۷۔

تعدادِ اشعار: ۹

تغیر الفاظ :

دیوان: کسی کا درد ہو دل بے قرار اپنا ہے
سویرا: کسی کا دل دُکھے دل بے قرار اپنا ہے
دیوان: اسی لیے یہاں کچھ لوگ ہم سے جلتے ہیں
سویرا: اسی سبب سے تو جلتے ہیں بوالہوس ہم سے

---

(۲۳) غزل: تری نگاہ کے جادو بکھرتے جاتے ہیں
تعدادِ اشعار: ۵
جریدہ: نئی قدریں، حیدرآباد سندھ، شمارہ: ۲، ۲ء۱۹۷ء۔
تعدادِ اشعار: ۴شعر، بہ خطِ ناصر
دیوان میں اضافی شعر: ایک

میں خواہشوں کے گھروندے بنائے جاتا ہوں
وہ محنتیں مری برباد کرتے جاتے ہیں

تغیر الفاظ:

دیوان: کہ ہم سفر تو مرے پار اترتے جاتے ہیں
نئی قدریں: کہ ہم سفر تو کبھی پار اترتے جاتے ہیں

---

(۲۴) غزل: کب تلک مدعا کہے کوئی
تعدادِ اشعار: ۹
جریدہ : ''نیا دور''، شمارہ: ۱۳۔۱۴۔
''جائزہ''، اگست ۱۹۵۹ء (بہ شکریہ ''نیا دور'')
''نقش''، ا۔۱۹۵۹ء (بہ شکریہ ''نیا دور)
تعدادِ اشعار: ۹
نیا دور میں اضافی شعر: ایک

اجنبی شہر لوگ نامانوس
کیا سے کوئی کیا کہے کوئی

دیوان میں اضافی شعر: ایک

غیرتِ عشق کو قبول نہیں
کہ تجھے بے وفا کہے کوئی

تغیر الفاظ :

دیوان:	کس کو درد آشنا کہے کوئی
نیادور:	کس کو غم آشنا کہے کوئی

----

(۴۵) غزل: تو ہے یا تیرا سایہ ہے

تعدادِ اشعار: ۷

جریدہ: ''لیل ونہار''، لاہور، ۱۸ فروری ۱۹۶۲ء۔

تعدادِ اشعار: ۱۲

لیل ونہار، لاہور میں اضافی اشعار: ۵

اس نگری میں کس کو پکاروں
جنگل کا سا سناٹا ہے

اتنے بڑے پھیلے شہروں میں
اپنا تو دم گھٹنے لگا ہے

بڑھتی جاتی ہے آبادی
انسانوں کا کال پڑا ہے

دیر سے چمک رہی ہے بجلی
دُور کہیں بادل برسا ہے

کھڑکی کھول کے دیکھ تو باہر
دیر سے کوئی شخص کھڑا ہے

[آخری شعر ''دیوان'' کی ایک اور غزل ''میں ہوں رات کا ایک بجا ہے'' میں موجود ہے۔]

تغیر الفاظ :

دیوان:	رستے	میں	دریا	پڑتا	ہے
لیل و نہار:	رستے	میں	دریا	بہتا	ہے

----

(۲۶) غزل: دل کے لیے درد بھی روز نیا چاہیے

تعدادِ اشعار: ۹

جریدہ: ''سویرا''، لاہور، شمارہ نمبر ۱۹، ۲۰، ۲۱۔

تعدادِ اشعار: ۱۱

سویرا میں اضافی اشعار: ۲

تنگ ہیں ارض و سما اہلِ وفا پر تو کیا
دل تو ہے غم آشنا دل میں رَہا چاہیے
ست ہے دل کی صدا ماند ہے ساری فضا
شاعرو ! صورت گرو! کچھ تو کیا چاہیے

تغیر الفاظ:

دیوان: بیٹھے ہو کیوں ہار کے سائے میں دیوار کے
شاعرو، صورت گرو! کچھ تو کیا چاہیے

سویرا: بیٹھے ہو کیوں ہار کے، سائے میں دیوار کے
چلنے کو ہیں قافلے، اب تو چلا چاہیے

----

(۲۷) غزل: زمیں چل رہی ہے کہ صبحِ زوالِ زماں ہے

تعدادِ اشعار: ۸

جریدہ: ''سویرا'' لاہور، شمارہ ۱۷، ۱۸۔

تعدادِ اشعار: ۱۰

سویرا میں اضافی اشعار: ۲

وہ دن ہے کہ افلاک میں کال ہے روشنی کا
قمر اس گھڑی شمس اور ارض کے درمیاں ہے
کہاں تک چلوں دھیان کے اجنبی راستوں میں
ہر اک موڑ پر اک نیا فاصلہ درمیاں ہے

تغیر الفاظ:

دیوان: کہیں تُو مرے عشق سے بد گماں ہو نہ جائے
کئی دن سے ہونٹوں پہ تیرے نہیں ہے، نہ ہاں ہے
سویرا: کہیں وہ مرے عشق سے بد گماں ہو نہ جائے
کئی دن سے ہونٹوں پہ اس کے نہیں ہے، نہ ہاں ہے
دیوان: جہانوں کے مالک زمانوں سے پردہ اٹھادے
سویرا: زمینوں کے خالق، جہانوں کے معبود پردہ اٹھا دے
دیوان: ترے فیصلے وقت کی بارگاہوں میں دائم
سویرا: ترے فیصلے فرش اور عرش کی بارگاہوں میں دائم

----

(۲۸) غزل: کارواں سست راہبر خاموش
تعدادِ اشعار: ۱۲
جریدہ ''نیادور'' کراچی، شمارہ ۱۱۔۱۲، ۵۸ء۔۱۹۵۷ء۔
تعدادِ اشعار: ۱۴
نیادور میں اضافی اشعار: ۲

بول اے دردِ شامِ تنہائی
کیسے گزرے گی تا سحر خاموش
سوچ اے ناشناسِ اہلِ ہنر
کیوں ہے یے خانۂ ہنر خاموش

تغیر الفاظ:

دیوان: تو جہاں ایک بار آیا تھا
نیادور: تم جہاں ایک بار آئے تھے

----

(۲۹) غزل: چھپ جاتی ہیں آئینہ دکھا کر تری یادیں

تعدادِ اشعار: ۴

جریدہ: ''نیادور'' کراچی، شمارہ ۵، ۶۔

(مطلع اور تیسرے شعر کو چھوڑ کر باقی اشعار ''نیادور'' میں بطور قطعہ بند دیے گئے ہیں)

تعدادِ اشعار: ۶

نیادور میں اضافی اشعار: ۲

تیرے لیے سرمایۂ جاں میری محبت
میرے لیے لعل و زر و گوہر تری یادیں
تیرے لیے کونین کی دولت مری غزلیں
میرے لیے مہر و مہ و اختر تری یادیں

تغیر الفاظ:

دیوان: محفل سی جمادیتی ہیں اکثر تری یادیں
نیادور: اک بزم سجادیتی ہیں اکثر تری یادیں
دیوان: جب تیز ہوا چلتی ہے بستی میں سرِ شام
نیادور: جب کوئی ہوا چلتی ہے بستی میں سرِ شام

----

(۳۰) غزل: گا رہا تھا کوئی درختوں میں

تعدادِ اشعار: ۱۲

جریدہ: ''سویرا'' لاہور، شمارہ نمبر ۱۹، ۲۰، ۲۱۔

تعدادِ اشعار: ۱۳

سویرا میں اضافی شعر: ایک

جل اٹھے درد کے اندھیرے رنگ
رات بجلی گری درختوں میں

تغیرالفاظ:

دیوان: مینہ جو برسا تو برگ ریزوں نے
سویرا: مینہ برسا تو برگ ریزوں نے

---

(۳۱) غزل: کہیں اجڑی اجڑی سی منزلیں، کہیں ٹوٹے پھوٹے سے بام ودر

تعدادِ اشعار: ۵

جریدہ : ''نیادور'' کراچی، شمارہ ۱۳، ۱۴۔

تعدادِ اشعار: ۵

تغیرالفاظ :

دیوان: جنھیں زندگی کا شعور تھا انھیں بے زری نے بچھا دیا
نیادور: جنھیں کچھ سلیقہ شعور تھا انھیں بے زری نے بچھا دیا
دیوان: مری بے کسی کا نہ غم کرو مگر اپنا فائدہ سوچ لو!
نیادور: چلو میری فکر نہ کیجیے مگر اپنا فائدہ سوچیے!

---

(۳۲) غزل: کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے

تعدادِ اشعار: ۵

جریدہ: ''نقش'' کراچی، شمارہ ۸، ۱۹۵۹ء۔ (بہ شکریہ ماہِ نو، کراچی)
''ماہِ نو''، کراچی، اگست ۱۹۵۹ء

تعدادِ اشعار: ۷

نقش میں اضافی اشعار: ۲

اٹھ گئی رسمِ مروّت ہی دلوں سے ورنہ
یار مے خانے میں بیٹھے ہی رہا کرتے تھے
تم جفا بھی نہیں کرتے تو جفا کرتے ہو
وہ وفا کرتے رہیں گے جو وفا کرتے تھے

تغیرالفاظ :

دیوان: کردیا آج زمانے نے انھیں بھی مجبور
نقش: کردیا آج کسی غم نے انھیں بھی مجبور

---

(۳۳)غزل: چہرہ افروز ہوئی پہلی جھڑی، ہم نفسو شکر کرو

تعدادِ اشعار: ۶

جریدہ: ''نیادور'' کراچی، شمارہ ۵۳، ۵۴۔

تعدادِ اشعار: ۵

دیوان میں اضافی شعر: ایک

آسماں لالہء خونیں کی نواؤں سے جگر چاک ہوا
قصرِ بے داد کی دیوار گری ہم نفسو شکر کرو

تغیرالفاظ:

دیوان: آج پھر دیر کی سوئی ہوئی ندی میں نئی لہر آئی
دیر کے بعد کوئی ناؤ چلی، ہم نفسو شکر کرو

نیادور: آج پھر دیر کی بچھڑی ہوئی یادوں نے پکارا دل کو
دیر کے بعد کوئی بات چلی ہم نفسو شکر کرو

---

(۳۴)غزل: حُسن کہتا ہے اک نظر دیکھو

تعدادِ اشعار: ۹

جریدہ: ''نقوش'' لاہور، شمارہ:۳۱۔۳۲، مئی جون ۱۹۵۳ء۔

تعدادِ اشعار: ۹

نقوش میں اضافی شعر: ایک

شاخ در شاخ شُعلے اڑتے ہیں
آگ کو بھی لگے ہیں پر دیکھو

دیوان میں اضافی شعر: ایک

پھول کو پھول کا نشاں جانو
چاند کو چاند سے اُدھر دیکھو

----

(۳۵) غزل: درد کم ہونے لگا آؤ کہ کچھ رات کٹے

تعدادِ اشعار: ۷

جریدہ: ''ہم قلم''، کراچی، اپریل ۱۹۶۱ء۔

تعدادِ اشعار: ۱۱

''ہم قلم'' میں اضافی اشعار: ۳ (مطلع کا پہلا مصرع دونوں جگہ الگ الگ ہے اور دوسرا مصرع مشترک ہے)

جی جلانا بھی عجب شغل ہے تنہائی کا
یہ الاؤ ذرا بھڑکاؤ کہ کچھ رات کٹے
نشے کی کس کو تمنا ہے مگر آج کی رات
خالی شیشوں ہی کو کھنکاؤ کہ کچھ رات کٹے
نیند نے آج تو آنے کی قسم کھائی ہے
آج تم یاد ہی آجاؤ کہ کچھ رات کٹے

تغیرِ الفاظ:

دیوان: درد کم ہونے لگا آؤ کہ کچھ رات کٹے
غم کی میعاد بڑھاجاؤ کہ کچھ رات کٹے

ہم قلم: چشمِ مے گوں ہی سے پلواؤ کہ کچھ رات کٹے
غم کی میعاد بڑھا جاؤ کہ کچھ رات کٹے

دیوان: اُسی بے درد کو لے آؤ کہ کچھ رات کٹے

ہم قلم: اسی بے درد سے ملواؤ کہ کچھ رات کٹے

----

(۳۶)غزل: جرمِ انکار کی سزا ہی دے

تعدادِ اشعار: ۸

جریدہ: ''فنون'' لاہور، اپریل ۱۹۶۸ء۔ ''فنون''، جدید غزل نمبر، جنوری ۱۹۶۹ء۔

تعدادِ اشعار: ۸

فنون میں اضافی شعر: ایک

تجھ کو مِلنا اگر نہیں منظور
عالمِ خواب میں صدا ہی دے

دیوان میں اضافی شعر: ایک

تو نے تاروں سے شب کی مانگ بھری
مجھ کو اک اشکِ صبح گاہی دے

تغیرِ الفاظ:

دیوان: شوق میں ہم نہیں زیادہ طلب
فنون: عشق میں ہم نہیں زیادہ طلب
دیوان: جُرمِ انکار کی سزا ہی دے
فنون: جُرمِ امید کی سزا ہی دے

---

(۳۷)غزل: قصے ہیں خموشی میں نہاں اور طرح کے

تعدادِ اشعار: ۹

جریدہ : ''سویرا'' لاہور، شمارہ: ۲۷۔

تعدادِ اشعار: ۹

سویرا میں اضافی شعر: ایک

اے ہم نفسو! صبر بڑی چیز ہے لیکن
ہوتے ہیں محبت میں زیاں اور طرح کے

دیوان میں اضافی شعر: ایک

پرسال تو کلیاں ہی جھڑی تھیں مگر اب کے
گلشن میں ہیں آثارِ خزاں اور طرح کے

تغیرِ الفاظ:

دیوان:	دل کو ہیں مرے وہم و گماں اور طرح کے
سویرا:	دل میں ہیں مرے وہم و گماں اور طرح کے
دیوان:	ہستی کا بھرم کھول دیا ایک نظر نے
سویرا:	ہستی کے بھرم کھول دیے ایک نظر نے

----

(۳۸)غزل: اب ان سے اور تقاضائے بادہ کیا کرتا

تعدادِ اشعار: ۵

جریدہ: ''نیادور'' لاہور، شمارہ: ۵۳۔۵۴۔

تعدادِ اشعار: ۵

تغیرِ الفاظ:

دیوان:	اب ان سے اور تقاضائے بادہ کیا کرتا
نیادور:	بہ قدرِ شوق تقاضائے بادہ کیا کرتا

----

(۳۹)غزل: دیارِ دل کی رات میں چراغ سا جلا گیا

تعدادِ اشعار: ۷

جریدہ : ''فنون'' لاہور، ''جدید غزل نمبر''، جنوری ۱۹۶۹ء۔

تعدادِ اشعار: ۸

فنون میں اضافی شعر : ایک

جو اور کچھ نہیں تو کوئی تازہ درد ہی ملے
میں ایک ہی طرح کی زندگی سے تنگ آ گیا

تغیرالفاظ:

دیوان: تجھے بھی نیند آ گئی مجھے بھی صبر آ گیا
فنون: اسے بھی نیند آ گئی مجھے بھی صبر آ گیا
دیوان: اب آئینے میں دیکھتا ہوں میں کہاں چلا گیا
فنون: اب آئینے میں ڈھونڈتا ہوں میں کہاں چلا گیا

----

(۴۰)غزل: کل جنھیں زندگی تھی راس بہت
تعدادِاشعار: ۶
جریدہ: ''نقوش''،لاہور،شمارہ ۵۸۔
تعدادِاشعار: ۹
نقوش میں اضافی اشعار:۵

زہرِ غم آ چلا ہے راس بہت
اب ہُوا جان کا ہراس بہت
غم بقدرِ طلب نہیں ملتا
پانی تھوڑا ہے اور پیاس بہت
صبح تک جانے ہم پہ کیا گزرے
دل ہے پھر شام سے اداس بہت
کون دیتا ہے دادِ زخمِ وفا
یوں تو ملتے ہیں روشناس بہت
جب کوئی دھیان سے گزرتا ہے
شور اٹھتا ہے دل کے پاس بہت

دیوان میں اضافی اشعار:۲
کل جنھیں زندگی تھی راس بہت
آج دیکھا انھیں اداس بہت

رفتگاں کا نشاں نہیں ملتا
اُگ رہی ہے زمیں پہ گھاس بہت

تغیرِ الفاظ:

دیوان: ہے یہاں درد کی اُگاس بہت

نقوش: ہے یہاں درد کا اگاس بہت

----

(۴۱)غزل: دل میں آؤ عجیب گھر ہے یہ

تعدادِ اشعار: ۷

جریدہ: ''نیادور'' کراچی، شمارہ ۱۱، ۱۲۔

تعدادِ اشعار: ۶

دیوان میں اضافی شعر: ایک

دن نکلنے میں کوئی دیر نہیں
ہم نہ سوجائیں اب تو ڈر ہے یہ

تغیرِ الفاظ:

دیوان: اب کوئی کام بھی کریں ناصرؔ
رونا دھونا تو عمر بھر ہے یہ

نیادور: آؤ اب زندگی کے کام آئیں
رونا دھونا تو عمر بھر ہے یہ

----

(۴۲)غزل: تو ہے دلوں کی روشنی، تو ہے سحر کا بانکپن

تعدادِ اشعار: ۷

جریدہ: ''آہنگ'' کراچی، شمارہ ۷، فروری ۱۹۶۵ء۔

تعدادِ اشعار: ۷

آہنگ میں اضافی شعر: ایک

نیند اڑی ہوا چلی شور اٹھا چمن چمن
پہنے عروسِ خاک نے رنگ برنگ پیرہن

دیوان میں اضافی شعر: ایک

تو ہے دلوں کی روشنی تو ہے سحر کا بانکپن
تیری گلی گلی کی خیر اے مرے دل رُبا وطن

تغیر الفاظ :

دیوان: وہ تو بس ایک موج تھی آئی اِدھر اُدھر گئی
آہنگ: وہ تو بس ایک لہر تھی آئی اِدھر اُدھر گئی
دیوان: کس سے کہوں کوئی نہیں، سو گئے شہر کے مکیں
آہنگ: سو گئے شہر کے مکیں، کس سے کہوں کوئی نہیں

----

(۴۳)غزل: یہ رنگِ خوں ہے گلوں پر نکھار اگر ہے بھی

تعدادِ اشعار: ۷

جریدہ : ''نیادور'' کراچی، شمارہ ۵۳، ۵۴۔

تعدادِ اشعار: ۷

نیادور میں اضافی شعر: ایک

نہ کارواں سے غرض ہے نہ منزلوں کی ہوس
کوئی چراغ سرِ رہ گزار اگر ہے بھی

دیوان میں اضافی شعر: ایک

لہو کی شمعیں جلاؤ قدم بڑھائے چلو
سروں پر سایۂ شب ہائے تار اگر ہے بھی

تغیر الفاظ:

دیوان: ابھی تو گرم ہے مے خانہ جام کھنکاؤ!
نیادور: ابھی تو گرم ہے مے خانہ جام چھلکاؤ!

----

(۴۴) غزل: گنج گنج نغمہ زن بسنت آ گئی

تعدادِ اشعار: ۵

جریدہ: ''ماہِ نو'' کراچی، شمارہ: مارچ ۱۹۵۷ء۔

تعدادِ اشعار: ۶

''ماہِ نو'' میں اضافی شعر: ۲

کس خیال میں مگن پڑے ہو غم زدو
اب تو کیجیے سخن بسنت آ گئی
تم بھی کپڑے بدلو گھر سے نکلو دلبرو
اوڑھ کر نئے برن بسنت آ گئی

دیوان میں اضافی شعر: ایک

سبز کھیتیوں پہ پھر نکھار آ گیا
لے کے زرد پیرہن بسنت آ گئی

---

(۴۵) غزل: کہاں گئے وہ سخن ور جو میرِ محفل تھے

تعدادِ اشعار: ۶

جریدہ: ''نقوش'' لاہور، شمارہ: ۱۰۲، مئی ۱۹۶۵ء۔

تعدادِ اشعار: ۵

نقوش میں اضافی شعر: ایک

شناوروں کو ترے ڈوبنا ہی تھا منظور
قدم قدم پہ وگرنہ ہزار ساحل تھے

دیوان میں اضافی شعر: ۲

گزر گئے ہیں جو خوش بوئے رائگاں کی طرح
وہ چند روز مری زندگی کا حاصل تھے
پڑے ہیں سایۂ گل میں جو سرخ رو ہو کر
وہ جاں نثار ہی اے شمع تیرے قاتل تھے

تغیر الفاظ :

دیوان: اب ان سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ناصرؔ
وہ ہم نوا جو مرے رتجگوں میں شامل تھے

نقوش: اب اُن سے آنکھ ملانے کو جی ترستا ہے
کبھی جو لوگ مرے رت جگوں میں شامل تھے

----

(۴۶) غزل: شوق کیا کیا دکھائے جاتا ہے

تعدادِ اشعار: ۷

جریدہ: ''نیا دور'' کراچی، شمارہ ۱۱، ۱۲۔

نیا دور میں اضافی شعر: ایک

چھپتی جاتی ہیں یاد کی گلیاں
دشتِ غم خاک اڑائے جاتا ہے

تغیر الفاظ:

دیوان: شوق کیا کیا دکھائے جاتا ہے
دل تجھے بھی بھلائے جاتا ہے

نیا دور: عشق کیا کیا دکھائے جاتا ہے
دل اسے بھی بھلائے جاتا ہے

دیوان: رنگ پیلا ہے تیرا کیوں ناصرؔ

نیا دور: چہرہ اُترا ہے تیرا کیوں ناصرؔ

----

(۴۷) غزل: بے بنائے ہوئے راستوں پہ جا نکلے

تعدادِ اشعار: ۵

جریدہ: ''ہم قلم'' کراچی، جون ۱۹۶۱ء

تعدادِ اشعار: ۶

ہم قلم میں اضافی شعر: ایک

کِھلا نہ غنچۂ دل ہی تو پھر بلا سے مری
ہزار غنچے کھلاتی ہوئی صبا نکلے

تغیر الفاظ:

دیوان: یہ ہم سفر مرے کتنے گریز پا نکلے
ہم قلم: وہ ہم سفر مرے کتنے گریز پا نکلے

---

(۴۸) غزل: رقم کریں گے ترا نام انتسابوں میں

تعدادِ اشعار: ۹

جریدہ: ''نیا دور'' کراچی، شمارہ: ۷، ۸۔

تعدادِ اشعار: ۱۳

نیا دور میں اضافی اشعار:

نجوم و مہر و مہ و برق ہوں کہ لالہ و گُل
تُو ایک ہی نظر آتا ہے سو حجابوں میں
نہ آپ آئی نہ کوئی خبر عطر ہی (؟) بھیجی
بہار خاک اڑاتی ہے کن خرابوں میں
تڑپ کے جاگ اٹھا خامشی کا ہر شعبہ
چُھپی ہوئی تھی یہ کس کی صدا ربابوں میں
یہ زمزمے نہ سنے تھے کسی مغنّی سے
یہ کیفیت نہ ملی تھی کبھی شرابوں میں

[غالباً ''عطر ہی'' کی جگہ ''ادھر'' ہونا چاہیے]

---

(۴۹) غزل: گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ

تعدادِ اشعار: ۱۲

ا۔ جریدہ: ''آہنگ'' کراچی، ۱۶، اپریل ۱۹۶۴ء

تعدادِ اشعار: ۱۳

آہنگ میں اضافی شعر: ایک

ہوس کی امید پر نہ ٹھہرا کسی بھی امید کا گھروندا
چلی ذرا سی ہوا مخالف غبار بن کر بکھر گیا وہ

تغیر الفاظ:

دیوان: کچھ اب سنبھلنے لگی ہے جاں بھی بدل چلا دورِ آسماں بھی
آہنگ: کچھ اب سنبھلنے لگی ہے جاں بھی بدل چلا رنگِ آسماں بھی

----

(۵۰) غزل: زباں سخن کو سخن بانکپن کو ترسے گا

تعدادِ اشعار: ۶

جریدہ: ''نیا دور''، شمارہ ۱۱، ۱۲۔

تعدادِ اشعار: ۷

نیا دور میں اضافی شعر: ایک

مری نظر میں ہے تہذیبِ حال کا انجام
مجھے خبر ہے یہ مردہ کفن کو ترسے گا

کتابیات

۱۔ احمد مشتاق: ''ہجر کی رات کا ستارہ'' لاہور، نیا ادارہ، ۱۹۸۳ء

۲۔ حسن عباس رضوی، سید، ڈاکٹر: ''ناصر کاظمی: شخصیت اور فن'' (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی)

۳۔ ناصر کاظمی: ''کلیاتِ ناصر''، لاہور، فضل حق اینڈ سنز، ستمبر ۱۹۹۲ء۔

رسائل:

۱۔ ''آہنگ''، کراچی: ۱۶، اپریل ۱۹۶۴ء۔ ۷، فروری ۱۹۶۵ء۔ ۷، مئی ۱۹۶۵ء۔

۲۔ ''ادبِ لطیف''، لاہور: سال نامہ ۱۹۵۳ء، سال نامہ ۱۹۵۵ء۔

۳۔ ''اوراق''، لاہور: شمارہ (۳)، ۱۹۶۶ء، شمارۂ خاص (۴)، ۱۹۶۶ء۔

۴۔ ''جائزہ''، کراچی: اگست ۱۹۵۹ء۔ سال نامہ ۱۹۶۰ء۔

۵۔ ''سیپ''، کراچی: شمارہ (۲)۔

۶۔ ''سویرا'' لاہور، شمارہ (۱۳۔۱۴)، (۱۵۔۱۶)، (۱۷۔۱۸)، (۱۹۔۲۰۔۲۱)، (۲۷)، (۳۱)۔

۷۔ ''صحیفہ'' لاہور: شمارہ، (۱۶)، جولائی ۱۹۶۱ء۔

۸۔ ''فنون''، لاہور: اپریل ۱۹۶۳ء، اکتوبر ۱۹۶۳ء، فروری، مارچ ۱۹۶۶ء، جولائی، اگست ۱۹۶۶ء،
اپریل ۱۹۶۸ء، جنوری ۱۹۶۹ء، فروری ۱۹۷۰ء۔

۹۔ ''لیل ونہار''، لاہور: ۱۶، اگست ۱۹۵۹ء، ۱۸، فروری ۱۹۶۲ء۔

۱۰۔ ''ماہِ نو''، کراچی: دسمبر ۱۹۵۳ء، نومبر ۱۹۵۵ء۔

۱۱۔ ''نقش''، کراچی: شمارہ (۱)، ۱۹۵۹ء، شمارہ (۸)، ۱۹۵۹ء۔

۱۲۔ ''نقوش''، لاہور: شمارہ (۲۹۔۳۰)، فروری مارچ ۱۹۵۳ء، شمارہ (۳۱۔۳۲)، مئی جون ۱۹۵۳ء
شمارہ (۳۳۔۳۴)، اگست ستمبر ۱۹۵۳ء، شمارہ (۵۱۔۵۲)، جولائی ۱۹۵۵ء
شمارہ (۵۵۔۵۶)، مارچ ۱۹۵۶ء، شمارہ (۱۰۲)، مئی ۱۹۶۵ء۔

۱۳۔ ''نئی قدریں''، حیدرآباد (پاک): شمارہ (۲)، ۱۹۷۲ء۔

۱۴۔ ''نیا دور''، کراچی: شمارہ (۳۔۴)، (۵۔۶)، (۷۔۸)، (۱۱۔۱۲)، (۱۳۔۱۴)، (۵۳۔۵۴)

۱۵۔ ''ہم قلم''، کراچی: اپریل ۱۹۶۱ء، جون ۱۹۶۱ء، نومبر ۱۹۶۱ء۔

گوشۂ جامعات

سندھ یونیورسٹی ــــ علم کا ایک نیا گہوارہ

(سندھ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی کی ایک یادگار تحریر)

[''مادرِ علمی سندھ یونیورسٹی، ''پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج'' کے بعد پاکستان کی دوسری قدیم یونیورسٹی ہے۔ درس و تدریس کے علاوہ علمی، ادبی اور سائنسی تحقیق کے حوالے سے اس کی خدمات پاکستان کی کئی جامعات کے مقابلے میں نمایاں قرار دی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ جدید سندھ کی تعلیمی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ میں بھی اسے نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس جامعہ کی ان فتوحات کا سبب یہ ہے کہ اسے ابتداء ہی سے نہایت تجربےکار، تعلیمی شعبے کے ماہر، مخلص اور دیانت دار وائس چانسلرز کی خدمات حاصل رہیں۔

یہاں ہم اسی جامعہ کے ایک قابلِ ذکر وائس چانسلر ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی مرحوم [1] کا ایک ایسا خطبہ آپ صاحبانِ علم کی نذر کر رہے ہیں جو انھوں نے ''کل پاکستان تعلیماتِ اسلامی کانفرنس'' ۱۲ تا ۱۴ جنوری ۱۹۶۳ء کے موقعے پر سندھ یونیورسٹی میں پیش کیا تھا۔ یہی خطبہ کانفرنس کے موقعے پر شائع ہونے والے مجلّے ''ارمغان بہ یادگارِ جشنِ کل پاکستان تعلیماتِ اسلامی کانفرنس ۱۹۶۳ء'' ''سندھ یونیورسٹی''، حیدرآباد میں شائع ہوا۔

اس خطبے کی افادیت یہ ہے کہ اس میں ایسی اہم معلومات شامل ہیں، جن سے نہ صرف سندھ یونیورسٹی کے قیام کے مقاصد پر روشنی پڑتی ہے بلکہ اس عظیم درس گاہ کی ابتدائی تاریخ سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں سندھ یونیورسٹی پر لکھی جانے والی یہ پہلی قابلِ ذکر تحریر ہے۔ اور ایسے مدبر اور عالم فاضل کی یادگار ہے جو ادب اور سائنس دونوں میدانوں میں اپنی مثال آپ تھا۔ مدیر]

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے اس علاقے میں جو سابقہ صوبۂ سندھ (ملک میں ون یونٹ قائم تھا) پر مشتمل ہے تعلیم کی حالت ناگفتہ بہ تھی[۲] اور مسلمانوں کو، جو یہاں پر غالب اکثریت میں تھے، اس ابتری کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان ہوا۔ ان کی معاشی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ نجی تعلیمی ادارے کافی تعداد میں قائم کرسکتے۔

حالاں کہ سندھ کا صوبہ بمبئ پریسیڈنسی سے ۱۹۳۵ء میں الگ کیا گیا، لیکن چند ہائی اسکول اور تقریباً نصف درجن کالج جو موجود تھے، قیامِ پاکستان تک ''بمبئ یونیورسٹی'' کے زیرِ انتظام تھے۔

جو لوگ اخراجات برداشت کرسکتے تھے ان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے دور دراز جگہوں پر، جیسے علی گڑھ یا یورپ، جانا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ حالات تشفی بخش نہ تھے اور یہ عام طور سے محسوس کیا جاتا تھا کہ جب تک صوبے کے پاس اپنی یونیورسٹی نہ ہو، یہاں کے لوگ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں پیچھے رہیں گے اور جس کے نتیجے میں ان کے لیے دوسرے میدانوں میں بھی رکاوٹیں پیدا ہوں گی۔

اس سے قبل اس طرف کچھ اچھی کوششیں کی گئیں مگر اس تحریک کو ۱۹۴۳ء میں اس وقت زیادہ قوت ملی جب قائدِ اعظم نے ''مسلم لیگ'' کی ایک تعلیمی کمیٹی کا تقرر کیا۔ جس سے یہ کہا گیا کہ برصغیر میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت کے بارے میں رپورٹ پیش کرے اور اس میں ضروری اصلاح اور درستی کے لیے سفارش کرے۔

اس کمیٹی کی بڑی سفارشوں میں سے ایک سفارش یہ بھی تھی کہ سندھ کے صوبے میں ایک یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اس سفارش کے بعد اس تجویز پر کام شروع ہوا اور اس کو صوبائی اسمبلی سے پاس کرایا گیا۔ یونیورسٹی ایکٹ کو گورنر کی منظوری حاصل ہوئی اور (یہ ایکٹ) ۳ / اپریل ۱۹۴۷ء کو سندھ گورنمنٹ گزٹ میں چھپا۔ اس طرح سے یونیورسٹی کا قائم ہونا اور پاکستان کی پیدائش ساتھ ساتھ ہوئی۔

یونیورسٹی نے کراچی میں اپنا کام شروع کیا[۳]۔ پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم صاحب[۴] اس کے پہلے وائس چانسلر (۲۷ / اپریل ۱۹۴۷ء تا ۲۳ / مارچ ۱۹۵۱ء) تھے۔ ابتدائی کام بہت ہی ہنگامی فضا میں، جو تقسیم کے وقت تھی، کرنا پڑا اور وہ سب لوگ جو اس وقت اس سے متعلق تھے، اس کام کو شروع کرنے اور اس کو تقسیم کے بعد کے طوفان میں جاری رکھنے کے لیے خصوصی اعتراف خدمات کے مستحق ہیں۔

ابتدائی کام

اس ابتدائی مرحلے میں یونیورسٹی کا کام قدرتی طور پر الحاق اور امتحان تک محدود تھا۔ اور پڑھانے کا کام پورے طور پر وہ چند ہائی اسکول اور کالج کرتے تھے جن کو نجی ادارے چلا رہے تھے۔

۱۹۵۰ء کے آخر میں مرکزی حکومت نے وفاقی دارالحکومت (پاکستان کا پہلا دارالحکومت "کراچی" تھا۔) کے لیے "کراچی یونیورسٹی" قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس کی وجہ سے یہ ضروری ہوگیا کہ "سندھ یونیورسٹی" کو حیدرآباد منتقل کردیا جائے۔ علامہ۔ آئی۔ آئی قاضی ۵ کا تقرر وائس چانسلر کی حیثیت سے (۹) اپریل ۱۹۵۱ء میں ہوا۔ انھوں نے یونیورسٹی کی ترقی کے لیے عظیم اساسی کام کیا اور (۲۵ مئی) ۱۹۵۹ء تک، جب کہ انھوں نے خرابیِ صحت کی بنا پر چارج چھوڑا، یونیورسٹی کے کاموں کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ مئی ۱۹۵۱ء میں سندھ یونیورسٹی کے دفاتر حیدرآباد شہر میں اس کی موجودہ عمارت ۶ میں منتقل ہوئے۔

اس کام کے ساتھ ساتھ یہ بھی طے ہوا کہ یونیورسٹی کو اپنا کام صرف الحاق اور امتحان تک محدود نہ رکھنا چاہیے بلکہ آنرس اور پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے لیے تعلیمی شعبے بھی کھولنے چاہییں۔ چند سالوں کے دوران تقریباً پندرہ تعلیمی شعبے "معاشرتی علوم"، "تعلیم" وغیرہ کی فیکلٹیوں میں کھولے گئے اور سات تعلیمی شعبے "سائنس" کی فیکلٹی میں کھولے گئے۔ ۷

علم کی ان شاخوں میں جن کو یہ شعبے پڑھاتے ہیں وہ بنیادی مضامین شامل ہیں، جو ہر یونیورسٹی میں پڑھائے جاتے ہیں اور جن کے آنرس، ماسٹرس، اور ڈاکٹرس کے درجے ہر یونیورسٹی میں موجود ہیں۔ پاس ڈگری کے درجے الحاق شدہ کالجوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ جب یونیورسٹی ۱۹۵۱ء میں حیدرآباد منتقل ہوئی اور کراچی کے کالج اس کے دائرۂ اختیار سے جدا کرلیے گئے، تو یونیورسٹی کے احاطۂ اختیار میں صرف دو یا تین ڈگری کالج رہ گئے۔

فوراً ہی حکام نے اور لوگوں نے نجی اور گورنمنٹ کالج ہر ضلع میں کھولنے کی ایک جان دار تحریک شروع کی جس کے نتیجے میں اب تک تقریباً بیس ڈگری کالج اور اس سے کہیں زیادہ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کالج سارے ریجن میں قائم کیے گئے۔ اس کے علاوہ اور زیادہ اسکول اور کالج کھولنے کا مطالبہ اب تک جاری ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ "سندھ یونیورسٹی" کو پورے دو ڈویژنوں کے لیے، جو دس اضلاع پر مشتمل ہیں اور جن میں ساٹھ لاکھ سے زیادہ لوگ بستے ہیں، کام کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے تعجب خیز بات نہیں ہے کہ اس ریجن کو اور زیادہ تعلیمی اداروں کی ضرورت ہے۔

میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے درجے گذشتہ سال (۱۹۶۲ء) یونیورسٹی کے دائرۂ اختیار سے الگ کردیے گئے اور اسی سال ایک علیحدہ انٹرمیڈیٹ اور ثانوی تعلیم کا بورڈ قائم کیا گیا۔ ۸

جہاں تک پیشہ ورانہ مضامین کا تعلق ہے، جیسے "طب" اور "زراعت"، یونیورسٹی کے دائرۂ اختیار

میں ''لیاقت میڈیکل کالج''، حیدرآباد ۹ اور ''ایگری کلچر کالج''، ٹنڈو جام ۱۰ اور بہت سے ''لاء'' اور ''کامرس'' کے کالج، حیدرآباد اور دوسرے ضلعوں میں ہیں۔ میڈیکل اور ایگری کلچر کالج کے اپنے اپنے کیمپس ہیں اور اساتذہ، عمارت اور ساز و سامان کے نقطۂ نظر سے وہ ملک کے دوسرے کالجوں سے پیچھے نہیں ہیں۔

ابتدائی اہم ضروریات

کسی تعلیمی ادارے کو کھولنے سے پہلے جن دو ضروری چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سامان اور اساتذہ ہیں۔ ملک کی دوسری یونیورسٹیوں کی طرح اس یونیورسٹی کو بھی، تقریباً ہر شعبے میں مناسب پڑھے لکھے اور تجربے کار اساتذہ کے فقدان کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ابتدا میں یونیورسٹی مجبور تھی کہ ان لوگوں کا تقرر کرے جو دستیاب تھے اور جو ان حالات میں کام کرنے کے لیے تیار تھے۔ یونیورسٹی نے بہرحال اپنے چند طلباء کو اور نئے اساتذہ کو اعلیٰ تعلیم اور ریسرچ کے لیے باہر بھیجا۔ اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ان حضرات کی واپسی کے ساتھ ساتھ حالات بتدریج بہتر ہو رہے ہیں۔

ایک سنگین دشواری جس کی وجہ سے یونیورسٹی کو ابتدائی مرحلے میں سخت نقصان اُٹھانا پڑا وہ مالی دشواری تھی۔ ابتداء کے چند سالوں میں اس کو صرف ایک لاکھ کی سالانہ گرانٹ ملتی تھی جو ۱۹۵۵ء میں پانچ لاکھ روپے تک بڑھا دی گئی۔ ظاہر ہے کہ یونیورسٹی اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار اساتذہ کو جو آنرس اور پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے لیے ضروری تھے، کافی تنخواہ نہیں دے سکتی تھی۔ ۱۹۵۶ء سے گرانٹ بتدریج بڑھا دی گئی۔ گذشتہ سال صوبائی اور مرکزی حکومتوں نے یونیورسٹی کو اپنے روزمرہ کے اخراجات اور توسیع کی اسکیموں کے لیے پچاس لاکھ سے زیادہ کی گرانٹ دی اور اس سال اس کو تقریباً پچھتر لاکھ کی گرانٹ اس کی مختلف ضرورتوں کے لیے ملی ہے۔

تنخواہ کے اسکیل

اس اضافے نے یونیورسٹی کے لیے یہ ممکن بنا دیا کہ وہ اپنے تنخواہوں کے اسکیل کو دوسری یونیورسٹی کے برابر کردے۔ چنانچہ اس یونیورسٹی نے بہت سے باہر سے تعلیم یافتہ اور اعلیٰ ریسرچ کیے ہوئے اسکالرس رکھ لیے۔ حالات اب اتنے خراب نہیں ہیں جتنے کچھ عرصے پہلے تھے اور یہ اُمید کی جاتی ہے کہ اچھے رہائشی مکانات اور بہتر سہولتوں کے ہوتے ہی یونیورسٹی کو اچھے اسکالر کافی تعداد میں ملنے لگیں گے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یونیورسٹی نے اپنی ترقی اور تنظیم کے کام میں غیر ملکی ماہرین اور مشیروں سے کبھی کوئی مدد نہیں لی اور نہ وہ کسی غیر ملکی امدادی ادارے کے تعاون کے پروگرام سے متعلق رہی۔

یونیورسٹی اس بات کی پوری کوشش کرتی رہی ہے کہ جو بھی اس کے محدود انسانی اور مالی وسائل ہیں ان کا پوری طرح استعمال کرے۔

عمارت کے معاملے میں دونوں، رہائشی اور تعلیمی ضرورتوں کے لیے، یونیورسٹی کو ابتداء ہی سے سخت دشواریوں کا سامنا ہے۔ جب یونیورسٹی ۱۹۵۱ء میں کراچی سے حیدرآباد منتقل ہوئی تو اس کو صرف ایک اسکول کی عمارت اپنی تمام ضروریات کے لیے مل سکی جن میں پڑھانے، انتظام اور رہائش کی ضروریات شامل ہیں۔ ۱! وہ عارضی اقامت گاہ ۲! جو یونیورسٹی کو دی گئی تھی وہ بہت زیادہ ناکافی تھی اور چند عمارتوں کی تعمیر کے بعد بھی جگہ کی کمی کا شدید احساس ہونے لگا۔

۱۹۵۰-۵۱ء میں یونیورسٹی نے تقریباً سات ہزار ایکڑ زمین "جام شورو" میں حاصل کی۔ یہ زمین حیدرآباد سے بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے اور وہاں نئے اقامتی کیمپس کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ اصلی منصوبے پر جو پہلے پانچ سالہ منصوبے کے لیے تیار کیا گیا تھا (تیرہ سال بعد) ۱۹۶۰ء میں نظرثانی کی گئی اور آخری منصوبے کو جس پر ایک کروڑ ساٹھ لاکھ روپیہ خرچ کا اندازہ ہے دوسرے پانچ سالہ منصوبے میں شامل کیا گیا۔

جگہ کی سخت تنگی

پرانے کیمپس میں جگہ کی تنگی کو دور کرنے کے لیے اور تعلیمی شعبوں کو زیادہ جگہ فراہم کرنے کے لیے سائنس کے شعبوں کو نئے کیمپس میں منتقل کر دیا گیا ہے اور ایک ہاسٹل کا بھی انتظام کیا گیا ہے جس میں دو سو لڑکے رہ سکتے ہیں۔ اساتذہ کے لیے بھی رہائش کا بندوبست کیا گیا ہے۔

یہ ارادہ ہے کہ یونیورسٹی کو آگے چل کر بالکل اقامتی یونیورسٹی بنا دیا جائے۔ مگر چوں کہ طلبا کی کافی بڑی تعداد اب تک پرانے شہر (حیدرآباد) میں رہتی ہے اس لیے یونیورسٹی انھیں نئے کیمپس تک لانے کے لیے اپنی بسیں چلا رہی ہے۔ یہ اُمید کی جاتی ہے کہ یونیورسٹی کے باقی شعبے آئندہ سال کے اختتام تک نئے کیمپس میں منتقل ہو جائیں گے۔ یونیورسٹی کی ترقی کا دوسرا مرحلہ تیسرے پانچ سالہ منصوبے کے تحت انجام پائے گا۔

یہ اوپر تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ یونیورسٹی نے پہلے ہی سے آرٹس، سائنس اور تعلیم کی فیکلٹیوں کے بنیادی مضامین کو پڑھانے کا بندوست کر رکھا ہے اور ان میں پاس، آنرس، ماسٹرس اور ڈاکٹرس کی ڈگری دیتی ہے اور اس کے الحاق شدہ کالجوں کے پاس طب، زراعت، قانون اور کامرس کے مضامین پڑھانے کا انتظام ہے۔

ایک اہم کمی

اب تک انجینئرنگ کالج کی عدم موجودگی ایک اہم کمی رہی ہے۔ یہ کمی اب دور کر دی گئی ہے اور اس کے لیے منصوبے مکمل کر کے منظور کر لیے گئے ہیں۔ یہ کالج، سول، میکینکل، الیکٹریکل اور ہر ایک انجینئرنگ

کی تعلیم دے گا[۱۳]۔ اس پر خرچ کا تخمینہ تقریباً ۲۳ (تیئیس) لاکھ روپیہ ہے۔ طلباء کی پہلی کلاس آئندہ سال انجینئرنگ کورس کے لیے شروع کی جائے گی اور اس اسکیم کے تکمیل پانے سے اس علاقے کے رہنے والوں کی بہت اہم ضرورتیں پوری ہوں گی۔ یونیورسٹی کے طالب علموں کو اب موقع ملے گا کہ وہ کوئی بھی بنیادی یا پیشہ ورانہ مضمون جس میں ان کا شوق اور رجحان ہو پڑھیں۔

اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ یونیورسٹی کو صرف اپنے کل وقتی طلبا ہی کا خیال نہ رکھنا چاہیے بلکہ پورے معاشرے کا خیال رکھنا چاہیے، یونیورسٹی نے حال ہی میں بہت سے پیشہ ورانہ مضامین کے لیے کئی ڈپلوما کورس شروع کیے ہیں۔ یہ ڈپلوما کورس ''آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس''، ''بزنس ایڈمنسٹریشن''، ''کوآپریشن''، ''سوشل ویلفیئر''، ''ووکیشنل گائڈینس''، ''فشریز''، ''اسٹے ٹس ٹکس'' وغیرہ ہیں[۱۴]۔ یہ کورس ان لوگوں کو مواقع فراہم کریں گے جو پہلے سے ملازمت میں ہیں تاکہ وہ اپنے کام کے متعلق تازہ معلومات حاصل کرسکیں اور زیادہ کامیاب ثابت ہوسکیں۔

لوگوں کی تمنا

ایک تمنا کا اظہار کیا گیا ہے کہ اس علاقے کے رہنے والوں کو ایک ایسی یونیورسٹی ملنی چاہیے جو اُن کے خوابوں کی تعبیر ہو۔ یہ ایک ناممکن بات نہیں ہے اور اکثر خواب سچے ثابت ہوجاتے ہیں۔ مگر اس کے لیے کام کرنے کے جذبے اور قربانی کی ضرورت ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے لیے جامع منصوبے بنائے جائیں اور قابلیت سے ان پر عمل کیا جائے اور دوسرے مفادات کو اس بات کی اجازت نہ دی جائے کہ اس راہ میں حائل ہوں۔

اگر تمنا مناسب ہے اور لوگ پورے خلوص سے اس کے لیے کام کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ یونیورسٹی اس ریجن میں علم کا گہوارہ نہ بن جائے، جو نہ صرف پرانی تہذیب کا گہوارہ ہے بلکہ اس برصغیر میں اسلامی دور کے آغاز کا نشان بھی ہے۔

حواشی

(۱) ''ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ۲۶ مئی ۱۹۵۹ء سے ۲۷ ستمبر ۱۹۶۴ء تک سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ آپ ۲ جنوری ۱۹۰۸ء کو حیدرآباد، دکن میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۵ء کے درمیان انھوں نے ''عثمانیہ یونیورسٹی'' حیدرآباد سے فرسٹ ڈویژن میں اعزاز کے ساتھ میٹرک، انٹرمیڈیٹ اور بی اے کرلیا تھا۔ اس کے بعد آپ کو یورپین اسکالرشپ دیا گیا۔ جس کی بنا پر ۱۹۲۸ء میں ''کیمبرج یونیورسٹی'' سے رضیات میں TRIPOS کی سند حاصل کی۔ اور پھر ۱۹۳۱ء میں

''لیپ زگ یونیورسٹی''، جرمن سے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۴۲ء میں ''عثمانیہ یونیورسٹی'' نے اعلیٰ تعلیمی اور تحقیقی کاموں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری عطا کی۔ اس کے علاوہ آپ کا ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ کوئنٹم مکینک کے نظریے پر کتاب لکھنے پر آپ کو ۱۹۳۸ء میں نوبل پرائز کے لیے نامزد کیا گیا۔ اور آپ کو یہ منفرد اعزاز بھی حاصل ہے کہ آپ نے پروفیسر ہائزن برگ اور سائنس کی دنیا کے نامور پروفیسر آئن اسٹائن کے ساتھ کام کیا ان کے علاوہ ہندوستان کے ممتاز ترین سائنس دانوں کے ساتھ بھی تحقیقی کام کیے۔ ان میں سر سی وی امن، کے ایس کرشنن، بیربل سانی، ایچ جے بھابھا، این آر سین ڈی ٹی ڈی کوسبی، اور ڈاکٹر ایس ایس بھٹنا گر وغیرہم شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مغربی دنیا کے ممتاز ترین سائنس دانوں سے ملنے تبادلۂ خیال کرنے، اُن کے لیکچر سننے کا موقع ملا اور ان کی موجودگی میں آپ نے ہارورڈ اور شکاگو کی یونیورسٹیوں میں لیکچر بھی دیے۔ اسی دوران نامور پروفیسر Nieis Bhor سے خصوصی ملاقات کی اور اُن سے ایٹم کے تازہ ترین نظریے کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا۔

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی نے بیرونی ممالک میں منعقدہ بے شمار کانفرنسوں میں سرکاری مندوب کی حیثیت سے شرکت کی اس کے علاوہ ہندوستان و پاکستان میں وہ جن عہدوں پر فائز رہے اُن کی فہرست بہت متاثر کن اور مرعوب کرنے والی ہے۔ وہ ہندوستان کی سائنٹی فِک انجمنوں کے رکن یا صدر اُس وقت بھی منتخب ہوئے جب ہندوستان کی فضا فرقہ واریت کے بدترین زہر سے آلودہ تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی ہندوستانی سائنس دانوں نے انھیں کم از کم چھ مرتبہ اعزاز و امتیاز کے عہدوں پر منتخب کیا۔

بہر کیف ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ۱۹۳۴ء سے مرتے دم تک ملی، غیر ملکی اور بین الاقوامی سائنس سوسائٹیوں کے صدر اور رکن رہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۵۳ء سے آخر وقت تک پاکستان اکیڈمی آف سائنس کے بانی سیکریٹری اور سیکریٹری جنرل رہے۔ آپ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۰ء تک علی گڑھ یونیورسٹی کے اعزازی پروفیسر رہے۔ اس کے علاوہ آپ جن چار جامعات کے وائس چانسلر رہے ان میں عثمانیہ یونیورسٹی بھارت (جہاں آپ شاگرد بھی رہے) پشاور یونیورسٹی، سندھ یونیورسٹی اور قائداعظم یونیورسٹی شامل ہیں۔۔ آپ کو قائدِ اعظم یونیورسٹی کے بانی وائس چانسلر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ان جامعات میں سے پشاور یونیورسٹی اور قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد نے انھیں پروفیسر ایمریطس کے عہدے سے بھی نوازا۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی بے مثال سائنسی اور تعلیمی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۶۰ء میں صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے ''آرڈر آف میرٹ'' عطا کیا۔ ۱۹۶۲ء میں وفاقی جمہوریہ جرمنی کے صدر نے جرمن ایوارڈ "Grosse Verdienst Kreuz" سے سرفراز کیا اور ۱۹۸۱ء میں جنرل محمد ضیاء الحق نے ''ہلالِ امتیاز'' سے نوازا۔

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی علم و فضل کی روشن اور تابندہ مثال ہیں۔ آپ نے سائنس اور ادب دونوں میدانوں میں نام روشن کیا۔ جہاں تک لسانی استعداد کی بات ہے تو آپ اُردو، عربی، فارسی، انگریزی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ اُردو ادب کے حوالے سے آپ ادبی تحقیق کے اُصول اور مسائل کے علاوہ اقبالیات اور ادبی تحریکات وغیرہم پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ انھیں غیر معمولی خوبیوں کی بناء پر آپ کے تحقیقی و تنقیدی کام قدر کی نگاہ

سے دیکھے جاتے ہیں ۔۔۔ آپ نے ۲ جنوری ۱۹۹۸ء بمطابق ۱۳ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ بروز جمعہ ۹۰ سال کی عمر میں اسلام آباد میں انتقال کیا۔ شمیم صہبائی متھراوی نے قطعہ تاریخ وفات کہا:

رضی الدین صدیقی جو اک تعلیمی رہبر تھے
بنے حکمِ خدا سے مالکِ خلدِ خدا ، لکھ دے
اگر چاہے شمیم ان کے لیے تاریخ رحلت کی
رضی الدین صدیقی ہوئے از بس جدا ، لکھ دے

۱۴۱۸ھ

[ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی سے متعلق زیادہ تر معلومات ریڈیو کا رسالہ ''آہنگ'' (شمارہ یکم اگست تا ۱۵ اگست ۱۹۸۲ء) میں شائع ہونے والے قومی دستاویزی پروگرام ''روشن مثال'' کی روداد مرتبہ صفدر ہمدانی سے حاصل کی گئی ہیں اس کے علاوہ ڈاکٹر نظیر صدیقی کے مضمون ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔ ایک اقبال شناس (مطبوعہ ''قومی زبان''، کراچی، شمارہ اپریل ۲۰۰۰ء) اور ماہ نامہ ''قومی زبان''، کراچی، مارچ ۱۹۹۹ء صفحہ ۷۷ سے مستفاد ہیں۔

(۲) تفصیلی مطالعے کے لیے ملاحظہ کیجیے۔ (۱) ''رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو ایجوکیشنل کانفرنس''، کراچی، ۱۹۰۷ء۔ مرتبہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ، ۱۹۰۸ء۔ (۲) حالی کا صدارتی خطبہ مشمولہ ''کلیاتِ نثرِ حالی''، جلد دوم، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء، ص ۱۴۱۔ (۳) ''الطاف حسین حالی کراچی میں'' از مظہر یوسف، مشمولہ مجلّہ ''پرکھ''، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، ۱۹۷۸ء، ص ۲۸ تا ۱۱۲۔

(۳) ابتداء میں یہ یونیورسٹی کراچی میں ''این جے وی ہائی اسکول'' کی عمارت میں شروع ہوئی'' ۔ (''حیدر آباد''، از عشرت علی خاں، ص ۲۷۸) آج کل یہ عمارت ''اسمبلی بلڈنگ'' کہلاتی ہے۔

(۴) ممتاز ماہرِ تعلیم، مؤرخ، دانش ور، سندھ یونیورسٹی اور جامعہ کراچی کے پہلے وائس چانسلر پروفیسر ابوبکر احمد حلیم، یکم مارچ ۱۸۹۷ء میں گیا (بہار) میں پیدا ہوئے۔ اور ۲۰ اپریل ۱۹۷۵ء بروز اتوار کراچی میں انتقال کیا۔ آپ پاکستان آنے سے قبل مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے۔ شمیم صہبائی متھراوی نے قطعۂ تاریخ وفات کہا:

جس سے گلہائے علم و فن مہکے
وہ بہارِ عظیم خُلد میں ہے
ملہمِ غیب نے شمیم کہا
پروفیسر حلیم خُلد میں ہے

۱۳۹۵ھ

(ماہ نامہ ''قومی زبان''، کراچی، جنوری ۱۹۷۶ء، ص ۱۳۸۔)

(۵) حضرت علامہ آئی آئی قاضی (امداد علی قاضی)، حیدر آباد کے مشہور عالم گھرانے سے تعلق، آپ کے والد امام علی قاضی خود بڑے دانش ور، علم و ادب دوست ہونے کے ساتھ ساتھ سرکارِ انگلیشیہ کی جانب سے آنریری مجسٹریٹ کے

عہدے پر متمکن رہے۔ ان کے گھر واقع ''تھوڑا چاڑی'' (حیدرآباد) پر ادیبوں، شاعروں اور موسیقاروں کی بیٹھک رہتی تھی۔ ایسے ادبی ماحول میں علامہ آئی آئی قاضی نے ۱۸۸۶ء میں آنکھ کھولی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے تمام مدارج طے کیے۔۔۔ علامہ نے نوکری حاصل کر کے کمالِ محنت سے خود کو سیشن جج کے عہدے پر پہنچایا۔ جو اُس دور میں بڑا عہدہ کہلاتا تھا۔ (آپ) انتظامی کونسل کے ہوم ممبر بھی رہے اور پھر ''سندھ یونیورسٹی'' کے وائس چانسلر کے عہدے سے مشرف ہوئے۔۔۔'' آپ نے ۱۹۵۱ء سے لے کر ۱۹۵۹ء تک اس منصب جلیلہ پر رہ کر اس مادرِ علمی کو معیاری تعلیم گاہ بنانے کی تمام تر کوششیں کیں۔ علامہ بہت بڑے اسکالر، علم دوست، فلسفی اور ماہر تعلیم تھے۔ جس کا اظہار اُن کے خطوط سے بھی ہوتا ہے۔۔۔ (آپ نے) ''شاہ جو رسالو'' پر تحقیقی کام کیا۔ آپ کی کتاب A Browh girl in seareh of God" مشہور ہے۔ علامہ کا انتقال ۱۳/اپریل، ۱۹۶۸ء کو ہوا''۔ (''حیدرآباد'' از عشرت علی خان، ص ۳۵۱۔) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور قطعہ تاریخ وفات بھی لکھا۔ یہی قطعہ علامہ کے کتبے پر بھی کندہ ہے۔ علاوہ ازیں اُن کے مقبرے کے لیے آرائشی آیات بھی ڈاکٹر صاحب نے اپنی نگرانی میں تیار کرائیں۔

مخدوم و محترم علامہ امداد علی امام علی قاضی، بارایٹ لا۔

گذشت افسوس ازیں دنیائے موہوم	بقیہ از سلف علامہ قاضی
تبحر داشت در معقول و منقول	تدبّر در قوانینِ سیاسی
مُبلّغ در علومِ دین و اخلاق	معلم در خلوص و دل نوازی
ز آثارش تصانیفِ عدیدہ	ز افکارش رموزِ حق شناسی
مزاجش نرم و نازک مثلِ گل بود	کلامش مستدل مانندِ رازیؒ
حیاتش صَرف شد در فکرِ قرآں	مماتش عبرت آموزِ جہانی
نہاں شد گنجِ علم و تاجِ دانش	بود در خُلد ایں علامہ قاضی
۱۳۸۸ھ	۱۹۶۸ء
۱۴ محرم الحرام شنبہ	۱۳ اپریل

(۶) سندھ یونیورسٹی، این جے وی ہائی اسکول، کراچی سے ''نیا ودیالہ اسکول'' (ایلسا قاضی کیمپس)، حیدرآباد میں منتقل ہوئی۔ (اس اسکول کی عمارت) رائے بہادر پربھداس ولد شیوداس نے۔۔۔ تعمیر کرائی، جو ۱۸۹۷ء میں بن کر مکمل ہوئی۔ اسے ہائی اسکول کا درجہ ۱۹۰۰ء میں ملا۔ اس عمارت کے ساتھ ایک چھوٹی عمارت ہاسٹل کے لیے بھی تھی۔۔۔ بمبئی کے گورنر سر جارج لائیڈ یہاں معائنے کے لیے آئے تھے اور گورنر لاسلاٹ گراہم نے بھی اس خوب صورت اسکول کا معائنہ کیا تھا۔

علامہ آئی آئی قاضی کے دور میں 'سندھ یونیورسٹی نیو کیمپس، جام شورو منتقل ہوگئی۔ (نیو کیمپس اب 'علامہ آئی آئی قاضی کیمپس'' کہلاتا ہے۔ اور حیدرآباد میں واقع کیمپس کو 'علامہ آئی آئی قاضی کی اہلیہ کے نام پر ''ایلسا قاضی

کیمپس'' کہا جاتا ہے۔) ان دنوں یہاں یونیورسٹی کی کچھ کلاسوں (فیکلٹی آف ایجوکیشن) کے علاوہ ماڈل اسکول (ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، سندھ یونیورسٹی ماڈل اسکول) چل رہے ہیں۔ (''حیدرآباد' از عشرت علی خاں، ص ۲۶۵۔)

(۷) شعبوں کے قیام کی تفصیل:

۱۹۵۱-۵۲ء ___ ۱۔ شعبۂ تعلیم ۲۔ شعبۂ تقابلِ ادیان وثقافت اسلامی۔

۱۹۵۲-۵۳ء ___ ۱۔ شعبۂ تاریخ اسلام ۲۔ شعبۂ عربی ۳۔ سندھی شعبہ ۴۔ شعبۂ اُردو، ۵۔ شعبۂ اقتصادیات، ۶۔ شعبۂ فلسفہ، ۷۔ شعبۂ فارسی،

۱۹۵۳-۵۴ء: ۱۔ شعبۂ انگریزی ۲۔ شعبۂ تاریخ عام ۳۔ شعبۂ سیاسیات ۴۔ شعبۂ نفسیات ۵۔ شعبۂ ریاضی۔

۱۹۵۴-۵۵ء ___ شعبۂ نباتیات۔

۱۹۵۵-۵۶ء ___ ۱۔ شعبۂ حیوانیات ۲۔ شعبۂ طبیعیات ۳۔ شعبۂ کیمیا ۴۔ شعبۂ جغرافیہ ۵۔ شعبۂ تربیت امتحان سی۔ایس۔ایس (برائے مرکزی وصوبائی ملازمت اعلیٰ) ۶۔ شعبۂ ریاضیات اور غیر نصابی سرگرمیاں۔

۱۹۵۶-۵۷ء ___ شعبۂ ارضیات۔

(ارمغان بہ یادگار جشنِ کُل پاکستان تعلیماتِ اسلامی کانفرنس، ۱۹۶۳ء، ص ۴)

(۸) ''ایک زمانے میں میٹرک کے امتحانات سندھ بھر میں 'بمبئی یونیورسٹی' کے تحت لیے جاتے تھے۔ پھر پاکستان بننے کے بعد میٹرک اور انٹر کے امتحانات 'سندھ یونیورسٹی' کی زیرِ نگرانی منعقد ہونے لگے۔ اس کے بعد ۱۹۶۱ء میں ''بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن کا قیام مضارام ہاسٹل میں جو بسنت ہال (حیدرآباد) کے برابر میں واقع ہے، عمل میں آیا۔۔۔ (اس کی دوسری عمارت) کا سنگِ بنیاد اللہ بچایو آخوند نے ۱۹۶۷ء میں رکھا اور یہ خوب صورت عمارت ۱۹۶۸ء میں مکمل ہوئی جو لطیف آباد (حیدرآباد) نمبر۹ میں واقع ہے۔ (''حیدرآباد''، از عشرت علی خاں، ص ۲۸۲۔)

(۹) ''۱۸۸۱ء میں انگریزوں نے ''سول ہسپتال'' (حیدرآباد) میں ''میڈیکل اسکول'' قائم کیا۔ جس کا الحاق ''بمبئی میڈیسن فیکلٹی'' سے تھا۔ واضح رہے کہ پہلے سندھ اور بمبئی ایک ہی صوبہ تھا۔ سندھ کی بمبئی سے علاحدگی کے لیے سندھ کے مسلمانوں نے تحریک چلائی۔ جس میں بالآخر انھیں کامیابی نصیب ہوئی اور اسے بمبئی سے الگ کر دیا گیا اور یوں سندھ میں ایک میڈیکل ادارے کی راہ ہموار ہوگئی چنانچہ ۱۹۴۵ء میں 'میڈیکل اسکول' کو کالج کا درجہ دے کر ۔۔۔ اس کا نام 'ڈاؤ میڈیکل کالج' رکھا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو 'ڈاؤ میڈیکل کالج' کو وفاق کی تحویل میں دے کر کراچی منتقل کر دیا گیا، اس کے بعد ۱۹۵۱ء میں 'سول اسپتال' حیدرآباد کی موجودہ عمارت میں 'سندھ میڈیکل کالج' قائم کیا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں 'سندھ میڈیکل کالج' کا نام بدل کر 'لیاقت میڈیکل کالج' رکھ دیا گیا۔ جو پاکستان کے پہلے وزیرِاعظم شہید نواب زادہ لیاقت علی خان کے نام پر رکھا گیا۔۔۔ پھر اس کالج کو جام شورو منتقل کر دیا گیا''۔ (''حیدرآباد' از عشرت علی خاں، ص ۲۷۹) ۲۰۰۳ء میں ''لیاقت میڈیکل کالج'' کو وسعت دے کر 'لیاقت یونیورسٹی میڈیکل اینڈ ہیلتھ سائنس'' کا درجہ دے دیا گیا ہے۔

(۱۰) اب ''سندھ ایگری کلچر یونیورسٹی ٹنڈو جام''۔

(۱۱) ''نیا ودیالہ اسکول'' دو حصوں پر مشتمل تھا ایک حصہ درس و تدریس کے لیے اور دوسرا رہائش کے لیے۔ ''سندھ یونیورسٹی'' کے قیام کے بعد رہائشی حصے (نیا ودیالہ ہاسٹل) میں'' کلاسوں کا انتظام کیا جانے لگا اور آج کل اس میں فیکلٹی آف ایجوکیشن قائم ہے''۔ (حیدرآباد، ص ۱۶۷) ''شروع میں مشرقی حصے کو رہائش کے طور پر اور مغربی حصے کو دفتری امور کے لیے مخصوص کیا گیا۔ جب کہ جنوب مغربی حصے کو سائنسی بلاک کے طور پر استعمال کیا گیا''۔ (''حیدرآباد''، ص ۲۷۸) شعبۂ اُردو کے قدیم شاگرد بتاتے ہیں کہ ''شعبۂ اُردو'' ایک کمرے میں قائم تھا۔ جس کو دفتری اُمور کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا اور تدریس کے لیے بھی۔ جب طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تو اکثر کلاسیں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کے گھر پر بھی ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کا گھر کیمپس کے احاطے ہی میں واقع ہے۔

(۱۲) سندھ یونیورسٹی کو قیام کے وقت رہائش کے لیے دو جگہیں ملیں تھیں پہلی تو یونیورسٹی کے احاطے ہی میں تھی۔ جہاں صرف اساتذہ رہا کرتے تھے۔ جب کہ دوسری جگہ ''گرونگر'' حیدرآباد میں۔ یہ علاقہ ''آفندی ٹاؤن'' اور ''فقیر کا پڑ'' کے نزدیک ہے۔ یہاں اساتذہ کے علاوہ شاگرد بھی رہا کرتے تھے۔ آج کل یہاں ایک پرائمری اسکول ''عباس بھائی'' کے نام سے قائم ہے۔ عشرت علی خاں نے اس رہائشی عمارت کو ''سندھ یونیورسٹی ہاسٹل گرونگر'' لکھا ہے۔ (''حیدرآباد''، ص ۱۶۷)۔ بعد ازاں ستھارام ہاسٹل بھی سندھ یونیورسٹی کی دسترس میں آ گیا۔

(۱۳) انجینئرنگ کی تعلیم دینے کی غرض سے ایک کالج ۱۹۶۳ء میں ''سندھ یونیورسٹی'' کے قانون کے تحت عمل میں لایا گیا۔ ۱۹۷۲ء کی تعلیمی پالیسی کے مطابق ۱۹۷۶ء میں اس کالج کو ''سندھ یونیورسٹی'' کا بڑا کیمپس ظاہر کیا گیا اور یکم مارچ ۱۹۷۷ء کو اسے ''انجینئرنگ یونیورسٹی'' کا درجہ دے کر اس کا نام ''مہران یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی'' رکھا گیا (''حیدرآباد''، ص ۲۸۰)۔

(۱۴) ان پیشہ ورانہ مضامین کو بین الاقوامی معیار کے مطابق پڑھانے کے لیے اب علاحدہ شعبے قائم ہو چکے ہیں۔ جن میں طلبا و طالبات کی ایک بہت بڑی تعداد زیرِ تعلیم ہے۔

کتابیات

۱۔ آفتاب احمد خان، صاحب زادہ: مرتب رپورٹ ''آل انڈیا محمڈن اینگلو ایجوکیشنل کانفرنس کراچی، ۱۹۰۷ء''، علی گڑھ، انسٹی ٹیوٹ پریس، ۱۹۰۸ء۔

۲۔ حالی، الطاف حسین: ''کلیاتِ نثرِ حالی''، جلد دوم، لاہور مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۶۸ء۔

۳۔ عشرت علی خان: ''حیدرآباد''، طبع اوّل، حیدرآباد، ادراک پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء۔

رسائل

۱۔ پندرہ روزہ ''آہنگ'' شمارہ یکم اگست تا ۱۵ اگست ۱۹۸۲ء۔

۲۔ شعبہ جاتی مجلّہ ''پرکھ'' شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، جام شورو، ۱۹۷۸ء۔

۳۔ ماہ نامہ ''قومی زبان''، کراچی، شمارے: جنوری ۱۹۷۶ء، مارچ ۱۹۹۹ء، اپریل ۲۰۰۰ء۔

نثار احمد

شعبۂ اُردو سندھ یونیورسٹی کے تحقیقی مقالات

(اشاریہ)

سندھ یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کا قیام ۵۳-۱۹۵۲ء میں ہوا۔ اس کے پہلے سربراہ قاضی محمد مرتضیٰ تھے۔ اس کے بعد ۱۹۵۶ء میں، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کا بحیثیت پروفیسر اور صدر شعبۂ اُردو تقرر ہوا۔ ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن کے مطابق:

> ''اُن کی وابستگی کے ساتھ یہاں تعلیم و تدریس اور تحقیق کے ایک مہتمم بالشان دور کا آغاز ہوا''۔(۱)

ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال لکھتے ہیں:

> ''اس کے بعد یہاں اُردو ادب کی تدریس و تحقیق کے ایک اہم دور کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت غور و فکر کے بعد ایم۔اے کے نصاب میں فنِ تحقیق، عربی، فارسی، اصلاح زبان و املا اور فنِ عروض کو شامل کیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۱ء میں شعبۂ اُردو میں مجلّہ ''صریرِ خامہ'' کا اجراء کیا۔ نصاب میں اِن پرچوں کے شامل کرنے کا مقصد طالب علموں میں اُردو کا عمدہ ذوق اور تحقیقی شعور بیدار کرنا اور ''صریرِ خامہ'' کا مقصد اِنھیں اپنی تحقیقی کاوشیں پیش کرنے کا موقع فراہم کرنا تھا''۔(۲)

ڈاکٹر کریم الدین احمد نے ''امیر مینائی اور اُن کے تلامذہ'' پر اپنے تحقیقی کام کی بدولت شعبۂ اُردو سے پہلے پی ایچ ڈی اسکالر کا اعزاز حاصل کیا۔ جب کہ ۱۹۷۰ء میں فضلِ حق خورشید کو ''اُردو نظم کا ارتقاء'' پر پہلی ایم فل کی سند تفویض ہوئی۔

۲۰۰۳ء تک سندھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ساٹھ (۶۰) اور ایم فل کی آٹھ (۸) اسناد دی جا چکی ہیں۔ جب کہ شعبۂ اُردو سے ڈی لٹ کی ایک اعلیٰ ترین سند معروف تاریخ نویس اور باکمال محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کو اُن کے تحقیقی کارنامے ''مثنوی نظامی دکنی المعروف بہ کدم راؤ پدم راؤ (مصنفہ فخر دین نظامی) کی ترتیب و تدوین پر ۱۹۷۶ء میں دی گئی۔ (۳) ایم۔اے میں جو مونوگراف لکھے گئے ان کی تعداد کے بارے میں کوئی حتمی اعداد و شمار میسّر نہیں۔ اس وقت یہ مونوگراف سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو، علامہ آئی آئی قاضی لائبریری، جام شورو اور سندھالوجی، جام شورو میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر منہاج الدین، ایم۔اے کے مقالات کی تعداد کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''کل ۲۳۹ مقالات کی فہرست مل سکی ہے ڈاکٹر نعیم ندوی صاحب اور ڈاکٹر نجم الاسلام کا کہنا ہے کہ اب تک کم و بیش (۵۰۰) پانچ سو مقالات، سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے اساتذہ کی راہنمائی میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن دَس (۱۰) مقالوں کے علاوہ سب نذرِ آتش کر دیے گئے'' (۴)

ڈاکٹر منہاج کا یہ بیان ۱۹۷۳ء کا ہے یوں ایک اندازے کے مطابق ان مونوگراف کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ ہے۔

شعبۂ اُردو میں ہونے والی تحقیقی سرگرمیوں کے بارے میں تفصیلات ۱۹۵۶ء سے، پندرہ روزہ ''قومی زبان''، کراچی میں ملتی ہیں بعد میں یہی معلومات شعبۂ اُردو کے مجلّے ''صریرِ خامہ'' کے شماروں میں بھی ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹر منہاج الدین نے ''سندھ کے اُردو نثر نگار'' کے عنوان سے پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ لکھا۔ جس میں صفحہ نمبر ۵۹۳ تا صفحہ ۶۱۰ میں شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی میں لکھے گئے مقالات کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں ڈاکٹر سلطانہ بخش کی مرتب کردہ کتاب ''اُصولِ تحقیق'' جلد دوم شائع ہوئی (۵)، جس میں ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن کا مقالہ ''پاکستانی جامعات میں اُردو کے پینتیس سال (۱۹۴۷ء۔۱۹۸۲ء)'' شائع ہوا۔ جس میں پہلی مرتبہ شعبۂ اُردو کے تحقیقی کاموں کا اجمالی جائزہ، بصورت اشاریہ شائع ہوا۔ بعد ازاں یہی مقالہ کتابی صورت میں پیش کیا گیا۔ (۶) اس کے بعد ۱۹۹۶ء میں شعبۂ

اُردو سندھ یونیورسٹی میں پروفیسر رابعہ اقبال کی زیر نگرانی ایم۔اے کا ایک مونوگراف صوفیہ بی بی نے ''پاکستانی جامعات کے مقالات'' کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔لیکن اس میں معلومات انتہائی ناقص اور نامکمل ہیں۔اس کے علاوہ سہ ماہی ''نئی عبارت'' حیدرآباد، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ نمبر اور ''حیدرآباد نمبر'' میں بھی شعبۂ اُردو سے متعلق معلومات ملتی ہیں، جن میں سے اکثر غلط ہیں (۷)۔رشید احمد خان کی مرتب کردہ کتاب ''ہمارے اُستاد'' ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں (۸) (مجموعۂ مضامین ڈاکٹر فضلِ حق خورشید) میں بھی شعبۂ اُردو میں ہونے والے علمی و تحقیقی کاموں کا ذکر ہے یہ معلومات ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے علمی، ادبی و تحقیقی کاموں کے ذیل میں فراہم کی گئی ہیں۔

شعبۂ اُردو سندھ یونیورسٹی میں لکھے گئے وہ مقالات جو شائع ہو چکے ہیں اُن کی نشان دہی سب سے پہلے ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن نے اپنے مذکورہ مقالے میں کی ہے بعد ازاں ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال نے مہناز ضمیر کی کتاب ''امراؤ طارق شخصیت و فن'' کی تقریبِ رونمائی کے موقع پر جو تاثراتی مضمون پڑھا (۸ ستمبر ۱۹۹۹ء) اُس کی ابتدا میں شعبۂ اُردو کے اُن مونوگراف کی نشان دہی کی جو شائع ہو چکے تھے۔اِس تاثراتی مضمون کی تلخیص شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلّے ''تحقیق نامہ''، جون، ۲۰۰۰ء میں شائع ہو چکی ہے۔

شعبۂ اُردو جامعۂ سندھ کے مقالات کی اس اشاریہ سازی میں بہت سی مشکلات پیش آئیں۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ تمام مقالات مکمل طور پر ایک جگہ موجود نہیں تھے۔۱۹۸۰ء کے بعد جو مقالات لکھے گئے ہیں، اُن کی ایک بڑی تعداد تو شعبۂ اُردو جامعۂ سندھ میں موجود ہے۔لیکن یہ بھی نامکمل ہے۔چند مقالات علامہ آئی آئی قاضی لائبریری میں مل جاتے ہیں۔جب کہ ایک قابلِ لحاظ تعداد میں مقالات سندھالوجی انسٹی ٹیوٹ جام شورو میں موجود ہیں۔کچھ مقالات ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کے ذاتی کتب خانے میں بھی ہیں۔ان تمام مقالات کی فہرست سازی کے بعد بھی بہت سے مقالات ایسے ہیں جو مذکورہ بالا جگہوں پر موجود نہیں تھے۔چنانچہ ہم نے پی ایچ ڈی اور ایم فل کے مقالات کی تفصیلات یونیورسٹی ریکارڈ سے حاصل کیں اس کے بعد مقالات حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ اُن کا طبعی معائنہ بھی فہرست میں شامل کیا جاسکے۔اس سے ہمیں یہ فائدہ ہوا کہ مقالات کی مطلوبہ تفصیلات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔مثلاً:

ڈاکٹر سردار احمد کے مقالے ''میر سوز آثار و افکار'' کے بارے میں جو معلومات مختلف ماخذات سے حاصل ہوئیں۔اُن سے یہ پتا نہیں چلتا کہ مقالہ کتنی جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کی صورتِ حال کیا ہے۔ طبعی معائنے کے دوران معلوم ہوا کہ اس کی پہلی جلد (صفحات ۳۶۶) میں میر سوز کے آثار و افکار پیش کیے

گئے ہیں جب کہ دوسری جلد (صفحات ۴۳۳) دواوین پر مشتمل ہے۔ جس کی ترتیب و تدوین پر بہت محنت کی گئی ہے۔ گویا یہ مقالہ کل ۷۸۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد احمد (توصیف تبسم) کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''منیر شکوہ آبادی حیات و شاعری'' بھی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اوّل (صفحات ۳۴۸) میں منیر کے حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ جب کہ حصہ دوم (صفحات ۵۸۲) شاعری سے متعلق ہے۔ اس طرح ڈاکٹر نظر کامرانی کے مقالے کی تفصیلات بھی شائع ہونے والی کسی فہرست میں شامل نہیں۔ متعدد مقالات جو یونیورسٹی میں نہیں مل سکے اُن کے بارے میں معلومات مقالہ نگاروں سے ملاقات کر کے حاصل کی گئی ہیں۔ معلومات پیش کرنے میں بھی کئی مسائل درپیش تھے۔ مثلاً ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات پر جو سنہ درج ہے، وہ مقالہ جمع کرانے کا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ درست نہیں کیوں کہ بہت سارے مقالات کے نتائج کسی اور سال میں ظاہر کیے گئے۔ اس اُلجھن کو یونیورسٹی کے ریکارڈ سے درست کیا گیا۔ ایم۔ اے کے مقالات میں دو مسئلے آئے پہلا یہ کہ نگران کا نام اور زمانۂ تحریر درج نہیں تھا۔ اس کے لیے ہم نے رسالہ ''قومی زبان'' کراچی اور ''صریرِ خامہ'' کے شماروں میں شائع ہونے والی تفصیلات سے استفادہ کیا ہے۔ سندھالوجی میں موجود مقالات پر لائبریرین نے جو سنہ ڈالے ہیں اُنھیں بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد مقالات ایسے ہیں جن پر نگراں کا نام اور سنہ تصنیف درج نہیں۔ چنانچہ فہرست میں ایسے مقالات کے لیے جن میں سنہ اور نگراں کا اندراج نہیں ہے وہاں ''ندارد'' تحریر کر دیا گیا ہے۔ کچھ مقالات ایسے ہیں جو مختلف فہرستوں میں تو مل جاتے ہیں۔ لیکن ہمیں حاصل نہیں ہو سکے۔ اُنھیں ''گمشدہ'' لکھ کر صراحت کی گئی ہے۔ ایسی ہی تین فہرستیں ہمیں ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال سے حاصل ہوئیں جس میں شعبۂ اُردو کے تحقیقی کاموں کے بارے میں قابلِ ذکر معلومات ہیں۔ پہلی فہرست میں ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۴ء کے عرصے میں لکھے گئے پی۔ ایچ۔ ڈی مقالات کی تفصیلات ہیں جب کہ دوسری فہرست صرف ایم۔ اے کے مقالات پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۰ء کے دوران لکھے گئے مقالات کی ہے۔ تیسری فہرست ۱۹۶۱ء سے ۱۹۸۳ء کے دوران لکھے گئے ایم فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالات کی ہے۔ افسوس پہلی فہرست کے درمیانی صفحات گم ہیں اور جو دستیاب ہیں وہ بھی نہایت بوسیدہ حالت میں ہیں۔ دوسری فہرست میں متعدد مقالات کی تکرار ہے اور یہ معلومات نامکمل ہیں۔ تیسری فہرست بھی اس لحاظ سے اُدھوری ہے کہ اس میں بھی معلومات نامکمل ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ تینوں فہرستیں کارآمد ثابت ہوئیں۔ متعدد مقالات کی نشان دہی ہوئی اور بہت سے مقالات کے سنہ اور نگراں کے نام کا تعین ہو گیا۔ ان فہرستوں کے ذریعے سے جو مقالات سامنے آئے اُنھیں بھی ''گمشدہ'' تحریر کیا گیا ہے۔

بعض ایسے شاگرد جنھوں نے اسلامیہ کالج سکھر سے ایم ۔اے کیا اور مقالات لکھے ان میں نگراں کا نام درج نہیں ہے، چنانچہ ان مقالات کے دیباچے پڑھنے کے بعد اگر نگراں کے نام کی وضاحت ہوتی ہے تو اُس اُستاد کا نام درج کر دیا گیا ہے۔ بصورتِ دیگر نگراں کے نام کی جگہ ندارد تحریر کر دیا گیا ہے۔

بہت ممکن ہے کہ پڑھنے والوں کو یہ خیال آئے کہ ایم ۔اے سے متعلق لکھے گئے مقالات کو اتنی اہمیت کیوں دی جارہی ہے اس حوالے سے ہمارا مؤقف یہ ہے کہ ایم ۔اے کی سطح پر لکھے گئے مقالات کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جنھیں شائع ہوجانا چاہیے کیوں کہ ان میں بہت سے مقالات ایسے ہیں جو آج کل ایم فِل اور پی ۔ایچ ۔ڈی کی سطح پر ہونے والے کاموں پر بھاری ہیں۔ متعدد مقالات تو ایسے ہیں جن کے حوالے اکثر مقالات میں ملتے ہیں۔

مقالات کی اس فہرست میں سب سے پہلے پی ۔ایچ ۔ڈی کے مقالات ہیں اس میں یہ طریقہ رکھا گیا ہے کہ جس اُستاد کی زیرِ نگرانی یہ مقالات لکھے گئے ہیں اُسی کے حوالے سے اُنھیں درج کیا جائے۔ لہٰذا سب سے پہلے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں پھر ڈاکٹر سیّد یحییٰ احمد ہاشمی اُس کے بعد ڈاکٹر نجم الاسلام پھر متفرق اساتذہ کی زیرِ نگرانی لکھے گئے مقالات کو پیش کیا گیا ہے۔ پی ۔ایچ ۔ڈی اور ایم فِل میں بھی یہی ترتیب رکھی گئی ہے۔ مقالات کی دیگر تفصیلات اس طرح ہیں:

''مقالے کا موضوع''، مقالہ نگار کا نام، نگراں کا نام، سنہ، صفحات، (اضافی معلومات حواشی میں)

مثلاً: ''امیر مینائی اور اُن کے تلامذہ''، ڈاکٹر کریم الدین احمد، ۱۹۶۲ء، ص ۳۱۷۔

ایم ۔اے کے مقالات میں پہلے موضوعاتی تقسیم کی گئی ہے۔ اس کے بعد فہرست کو موضوع وار پیش کیا گیا ہے۔ البتہ مقالے کی تفصیلات مذکورہ ترتیب کے مطابق پیش کی گئی ہیں:

''مقالے کا موضوع''، مقالہ نگار کا نام، نگراں کا نام، سنہ، صفحات، (اضافی معلومات حواشی میں)

مثلاً: ''آتش کے افکار اور سوانح''، اعظم راؤ، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۰۰۔

اس اشاریے میں پی ۔ایچ ۔ڈی، ایم ۔فل اور ایم اے کے وہ مقالات، جو کتابی صورت میں یا اُس کے کچھ اجزا شائع ہو گئے ہیں۔ اُن کی تفصیلات کو حواشی میں درج کیا گیا ہے۔ تاکہ اشاریے کا مطالعہ مفید تر رہے۔ حواشی پر کام ابھی جاری ہے، اس اشاریے کی اشاعتِ ثانی میں حاصل شدہ معلومات شامل کی جائیں گی۔

مجموعی طور پر شعبۂ اُردو میں موضوع اور مواد دونوں اعتبار سے قابلِ ذکر تحقیقی کام ہوئے ہیں۔ اور اسی حوالے سے شعبہ جاتی مجلّے ''تحقیق'' نے بلاشبہ شعبۂ اُردو اور سندھ یونیورسٹی کے وقار میں اضافہ کیا ہے۔ مدیر اخبارِ اُردو، محمد اسلام نشتر لکھتے ہیں:

''جامعۂ سندھ کا شعبۂ اُردو پاکستان ہی میں نہیں، بلکہ بیرونِ ملک بھی اپنی درسیات کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔اس شعبے کے جریدے ''تحقیق'' نے جہاں شعبے کے علمی وقار میں اضافہ کیا ہے وہاں جامعہ کا وقار بھی بلند کیا ہے۔ ...شعبۂ اُردو جامعۂ سندھ کی ان تحقیقی سرگرمیوں میں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، ڈاکٹر نجم الاسلام، ڈاکٹر سعدیہ نسیم اور ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال کی خدمات قابلِ قدر ہیں''۔(۹)

شعبۂ اُردو سندھ یونیورسٹی کی اس کامیابی کا سہرا بلاشبہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان صاحب کی خاص توجہ کا مرہونِ منت ہے۔ڈاکٹر صاحب کی ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے متین و فرمانبردار شاگرد ڈاکٹر سیّد یحییٰ احمد ہاشمی مرحوم (۱۹۲۵ء۔۱۹۹۵ء) اور باکمال و بے مثال شاگرد ڈاکٹر نجم الاسلام مرحوم (۱۹۳۳ء۔۲۰۰۲ء) نے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کی تحقیقی روایات کو آگے بڑھایا، اور آج کل شعبۂ اُردو میں تحقیقی کاموں کی نگرانی ڈاکٹر سعدیہ نسیم صاحبہ اور ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال صاحب سرانجام دے رہے ہیں۔زیرِ ترتیب اشاریہ جاوید صاحب نے تجویز کیا تھا اور اُن ہی کی راہنمائی اور مواد کی فراہمی سے یہ کام تکمیل کو پہنچا۔اُستادِ محترم کے علاوہ اِس کام میں جن حضرات نے تعاون کیا ان میں گل محمد مغل صاحب، اسد صاحب اور بخش علی شاہ صاحب قابلِ ذکر ہیں۔ میں ان تمام صاحبان کا بے حد ممنون ہوں۔

پی ایچ ڈی اُردو کے سند یافتگان۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کی زیرِ نگرانی لکھے گئے مقالات:

۱) ''امیر مینائی اور اُن کے تلامذہ''، ڈاکٹر کریم الدین احمد، ۱۹۶۲ء، ص۔۳۱۷، (۱۰)

۲) ''اُردو شاعری کا تاریخی اور سیاسی پس منظر''، ڈاکٹر خان رشید، ۱۹۶۳ء، ص۔۵۸۹ (۱۱)

۳) ''اُردو اور سندھی کے لسانی روابط''، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، ۱۹۶۵ء، ص۔۶۵۰ (۱۲)

۴) ''شبلی کا ذہنی ارتقاء''، ڈاکٹر سیّد یحییٰ احمد ہاشمی، ۱۹۶۶ء، ص۔۷۵۲ (۱۳)

۵) ''ناسخ اور اُن کے تلامذہ''، ڈاکٹر حسین بانو، ۱۹۶۸ء، گمشدہ۔

۶) ''دبستانِ دہلی کی نثر''، ڈاکٹر نجم الدین صدیقی (نجم الاسلام)، ۱۹۶۹ء، ص۔۶۱۴ (۱۴)

۷) ''اُردو میں قرآنی تراجم اور تفاسیر''، ڈاکٹر محمد مسعود احمد، ۱۹۷۰ء، ص۴۶۷۔

۸) ''جگر مراد آبادی آثار و افکار''، ڈاکٹر احمر رفاعی، ۱۹۷۰ء، ص۴۷۴۔ (۱۵)

۹) ''مولانا ظفر علی خان بحیثیت شاعر و صحافی''، ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی، ۱۹۷۰ء، ص ۶۹۱۔ (۱۶)
۱۰) ''پاکستان میں اُردو ناول''، ڈاکٹر عبدالحق (حسرت کاس گنجوی)، ۱۹۷۰ء، ص ۴۲۲۔
۱۱) ''دبستانِ شبلی کی علمی و ادبی خدمات''، ڈاکٹر شاہ محمد نعیم ندوی، ۱۹۷۱ء، گمشدہ۔
۱۲) ''قدیم اُردو ادب کا تحقیقی مطالعہ''، محمد جمیل خان (ڈاکٹر جمیل جالبی) ۱۹۷۱ء، ص ۳۹۴۔ (۱۷)
۱۳) ''میر سوز آثار و افکار و ترتیب دیوانِ سوز''، ڈاکٹر سردار احمد خان، ۱۹۷۱ء، ص ۳۶۶۔ (۱۸)
۱۴) ''اُردو کی داستانوں پر قرآنی قصص کے اثرات''، ڈاکٹر حسن محمد خان، ۱۹۷۱ء، ص ۳۱۳۔
۱۵) ''نذیر احمد اور اُن کی ناول نگاری''، ڈاکٹر منیر الدین عرشی، ۱۹۷۲ء، ص ۶۶۸۔
۱۶) ''اصغر گونڈوی آثار و افکار''، ڈاکٹر محمد اقبال احمد خان، ۱۹۷۲ء، ص ۷۴۱۔ (۱۹)
۱۷) ''غالبیات کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ''، ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن، ۱۹۷۲ء، ص ۷۸۸۔ (۲۰)
۱۸) ''اُردو میں احادیثِ نبوی کے ترجمے و تعلیقات''، ڈاکٹر حبیب الثقلین، ۱۹۷۳ء، گمشدہ۔
۱۹) ''اُردو میں قرآنی محاورات''، ڈاکٹر شمیم نکہت، ۱۹۷۳ء، ص ۴۳۰۔
۲۰) ''اُردو شاعری میں قرآنی تلمیحات''، ڈاکٹر کشور سلطانہ، ۱۹۷۳ء، ص ۳۸۰۔
۲۱) ''سندھ کے اُردو نثر نگار''، ڈاکٹر سیّد منہاج الدین، ۱۹۷۳ء، ص ۶۳۳۔
۲۲) ''اُردو شاعری پر قرآن و حدیث کے اثرات''، ڈاکٹر عبدالمقیت (شاکر علیمی) ۱۹۷۴ء، ص ۴۸۳ (۲۱)
۲۳) ''اُردو شعراء کی فارسی اور اُردو شاعری کا تقابلی مطالعہ''، ڈاکٹر یوسف فاروقی، ۱۹۷۴ء، ص ۵۳۰۔
۲۴) ''دکنی اُردو کی منظوم داستانیں''، ڈاکٹر محمد اقبال جاوید، ۱۹۷۴ء، ص ۶۰۰۔
۲۵) ''اُردو افسانے کا نفسیاتی مطالعہ''، ڈاکٹر غلام حسین اظہر، ۱۹۷۵ء، ص ۶۳۱۔
۲۶) ''اُردو نثر پر تصوف کے اثرات''، ڈاکٹر رفعت سلطانہ، ۱۹۷۵ء، ص ۵۷۲۔
۲۷) ''اُردو نظم کا تحقیقی جائزہ''، (میر جعفر زٹلی کے بعد سے دورِ حاضر تک) ڈاکٹر فضلِ حق خورشید، ۱۹۷۶ء، ص ۲۰۱۔
۲۸) ''سرسیّد اور حالی کا نظریۂ فطرت''، ڈاکٹر ظفر حسن، ۱۹۷۶ء، ص ۴۰۴ (۲۲)۔
۲۹) ''اُردو لغات کا ارتقاء''، ڈاکٹر سیّد انور علی، ۱۹۷۶ء، ص ۷۶۱۔
۳۰) ''سندھی، پشتو، اُردو کے لسانی روابط''، ڈاکٹر خالد خان خٹک، ۱۹۷۸ء، ص ۴۸۷۔
۳۱) ''اُردو شاعری کا دینی پس منظر''، ڈاکٹر ثریا صدیقی، ۱۹۸۱ء، ص ۳۵۱۔
۳۲) ''جنگ آزادی کے اُردو شعراء''، ڈاکٹر سیّد شاہ محمود الرحمٰن، ۱۹۸۱ء، ص ۴۷۳ (۲۳)

۳۳) ''اُردو شاعری پر مغرب کے اثرات''، (ایک تاریخی جائزہ) ڈاکٹر الیاس عشقی، ۱۹۸۲ء، ص ۵۵۷۔
۳۴) ''اُردو صرف ونحو کا ارتقاء''، ڈاکٹر نظر کامرانی، ۱۹۸۳ء، گمشدہ۔
۳۵) ''اُردو میں فقہی کتب کا تحقیقی جائزہ''، ڈاکٹر شاہ محمد ارشاد الحق قدوسی، ۱۹۸۷ء، ص ۶۶۰۔
۳۶) ''ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے محاورات''، ڈاکٹر مجیب الرحمٰن یوسفی، ۱۹۹۶ء، ص ۹۵۰۔ (۲۴)
۳۷) ''پاکستان کے اُردو ادب میں موجودہ بلوچستان کی ثقافت''، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن، ۱۹۹۷ء، ص ۶۴۹ (۲۵)
۳۸) ''کشمیر میں اُردو نثر کا تحقیقی مطالعہ''، ڈاکٹر ممتاز صادق، ۲۰۰۰ء، ص ۵۲۵۔
۳۹) ''مکتوباتِ امیر مینائی کا تحقیقی جائزہ''، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۲۰۰۲ء، ص ۴۳۴ (۲۶)

ڈاکٹر سیّد یحییٰ احمد ہاشمی صاحب کی زیرِ نگرانی لکھے گئے مقالات:

۴۰) ''اُردو شاعری کا معاشرتی پس منظر''، ڈاکٹر تاج الدین صدیقی، ۱۹۷۴ء، ص ۹۰۵۔
۴۱) ''خطباتِ گارسین دتاسی ترتیب وتعلیقات''، ڈاکٹر سیّد سلطان محمود حسین، ۱۹۷۷ء، ص ۱۱۴۱ (۲۷)
۴۲) ''اُردو اور سندھی صحافت کا تقابلی مطالعہ''، ڈاکٹر عبدالواحد خٹک، ۱۹۷۸ء، ص ۴۰۷۔
۴۳) ''مولانا حامد حسن قادری سوانح حیات اور ادبی خدمات''، ڈاکٹر سیّد نور محمد سرور، ۱۹۷۹ء، ص ۶۷۷ (۲۸)
۴۴) ''اُردو اور راجستھانی بولیاں''، ڈاکٹر عزیز انصاری، ۱۹۷۹ء، ص ۵۷۷ (۲۹)
۴۵) ''اُردو میں سیرۃ نبوی کا سرمایہ''، ڈاکٹر عبدالجبار خان، ۱۹۷۹ء، ص ۵۱۷۔
۴۶) ''براہوی اور اُردو کا تقابلی مطالعہ''، ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوی، ۱۹۷۹ء، ص ۴۰۰۔
۴۷) ''اُردو کی منظوم تمثیلیں''، ڈاکٹر سیّد اشفاق احمد بخاری، ۱۹۷۹ء، ص ۲۹۸۔
۴۸) ''تذکرہ خانوادۂ ولی اللہی از سرسیّد''، (مرتبہ)، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، ۱۹۸۰ء، ص ۳۴۷۔
۴۹) ''منیر شکوہ آبادی حیات وشاعری''، ڈاکٹر محمد احمد (توصیف تبسم)، ۱۹۸۸ء، جلد اوّل ص ۳۴۸، جلد دوم، ص ۵۸۲۔ کل صفحات۔ ۹۳۰۔

ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب کے زیرِ نگرانی لکھے گئے مقالات:

۵۰) ''اُردو میں تاریخ نویسی''، ڈاکٹر ظفر اقبال، ۱۹۸۳ء، ص ۴۴۲۔ (۳۰)
۵۱) ''اُردو میں صرفی نحوی تغیرات''، ڈاکٹر نسیم آرا سعید (سعدیہ تسنیم)، ۱۹۸۶ء، ص ۴۳۰ (۳۱)
۵۲) ''اُردو افسانے میں علامت نگاری''، ڈاکٹر اعجاز حسین (اعجاز راہی)، ۱۹۸۶ء، ص ۳۲۱ (۳۲)

۵۳) ''سندھ میں اُردو کی ادبی صحافت''، ڈاکٹر امین فاروق، ۱۹۸۷ء، ص ۴۰۲۔

۵۴) ''مکاتیب اقبال کا تنقیدی جائزہ''، ڈاکٹر رحیم بخش (رحیم بخش شاہین)، ۱۹۸۸ء، گمشدہ۔

۵۵) ''علامہ محمد انور شاہ کشمیری اُن کے متوسلین اور تلامذہ کی خدمات زبانِ اُردو''، ڈاکٹر خواجہ عبدالغنی، ۱۹۹۱ء، ص ۳۸۸۔

۵۶) ''نواب محبت خان محبت احوال و آثار''، ڈاکٹر فدا حسین انصاری، ۱۹۹۲ء، ص ۳۴۴۔

۵۷) ''اُردو نعت کے جدید رجحانات''، ڈاکٹر آنسہ شوکت چغتائی، ۱۹۹۳ء، ص ۴۴۴ (۳۳)۔

متفرق اساتذہ کی زیرِ نگرانی لکھے گئے مقالات:

۵۸) ''اُردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا حصّہ''، ڈاکٹر عبدالستار روفاراشدی، نگراں: مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی، ۱۹۸۲ء، ص ۵۷۴ (۳۴)

۵۹) ''عبدالعزیز فطرت کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین''، ڈاکٹر جمیل اختر، نگراں: ڈاکٹر سعدیہ نسیم، ۱۹۹۹ء، ص ۱۱۹۷۔

۶۰) ''علامہ اقبال کی اُردو شاعری میں فطرت نگاری اور ہم عصر شاعر حسرتؔ موہانی کی فطرت نگاری سے تقابلی جائزہ''، ڈاکٹر سیّد منور ہاشمی، نگراں: پروفیسر فہمیدہ شیخ، ۲۰۰۳ء، ص ۴۵۱۔

ایم۔فِل اُردو کے فائزین

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کی زیرِ نگرانی لکھے گئے مقالات:

۱) ''اُردو نظم کا ارتقاء''، (ابتداء سے میر جعفر زٹلی تک)، فضلِ حق خورشید، ۱۹۷۰ء، ص ۱۹۵۔

۲) ''ہندکو اور اُردو کا تقابلی مطالعہ''، احمد سعید پراچہ، ۱۹۷۵ء، ص ۳۵۰۔

۳) ''مولانا احمد رضا خاں کی ادبی خدمات''، رقیہ بیگم، ۱۹۸۲ء، گمشدہ۔

ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب کی زیرِ نگرانی لکھے گئے مقالات:

۴) ''مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی احوال و آثار''، حافظ ریاض احمد، ۱۹۸۰ء، ص ۴۲۵۔

۵) ''اُردو سندھی کے ارکانِ تہجی کا تقابلی جائزہ انگریزی دخیل الفاظ کے نقطۂ نظر سے''، کین ساکو مامیا، ۱۹۹۳ء، ص ۱۱۷ (۳۵)

۶) ''اُردو میں تبصرہ نگاری، آغاز و ارتقاء''، سیّد جاوید اقبال، ۱۹۹۵ء، جلد اوّل، ص ۱۸۹، جلد دوّم، ص ۱۴۱، کل صفحات ۳۳۰۔ (۳۶)

۷) ”مرزا فرحت اللہ بیگ شخصیت وفن“، عدنان محمود صدیقی، ۱۹۹۸ء، ص ۲۱۴۔

ڈاکٹر سعدیہ نسیم صاحبہ کی زیرِ نگرانی لکھا گیا مقالہ:

۸) ”برصغیر کے مسلمانوں کا جداگانہ تشخص اور اقبال ایک تنقیدی مطالعہ“، ظفر حسن ظفر، ۲۰۰۱ء، ص ۲۳۵۔

مونوگراف کا اشاریہ

۱) شخصیات

۲) اقبالیات

۳) غالبیات

۴) مطالعۂ خصوصی

۵) بچوں کا ادب

۶) اصناف

۷) ترتیب وتدوین

۸) ترجمہ وتعلیقات

۹) حواشی وتعلیقات

۱۰) تذکرہ وتاریخ

۱۱) فصاحت وبلاغت

۱۲) لسانیات / صرف ونحو

۱۳) اُردو تنقید

۱۴) ادبی رسائل کے جائزے

۱۵) توضیحی اشاریے

۱۶) متفرق اشاریے

ا۔ شخصیات

۱) ”آتش کے افکار اور سوانح“، اعظم راؤ، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، ۱۹۶۶ء، ص ۱۰۰ (۳۷)

۲) ”آتش کی غزل کا اخلاقی پہلو“، فہمیدہ غنی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، ۱۹۶۸ء، ص ۲۳۹۔

۳) ''آفاق صدیقی بحیثیت شاعر''نسیم چوہان،ڈاکٹر سعدیہ نسیم،۲۰۰۵ء،ص ۱۲۸۔
۴) ''اُردو کا جاسوسی ادب اور ابنِ صفی''،گل محمد،پروفیسر رابعہ اقبال،۱۹۹۱ء،ص ۱۰۹۔
۵) ''ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری ایک مطالعہ''،نعیم الرحمٰن،ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال،۲۰۰۰ء،ص ۱۴۸۔
۶) ''مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی خدمات''،محمد زبیر صدیقی،گمشدہ۔
۷) ''ابوالکلام آزاد غبارِ خاطر کی روشنی میں''،حسینہ کاظمی،ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان،۱۹۶۸ء،ص ۲۵۷۔
۸) ''ابوالکلام کی نثر''،فضل الدین نیازی،ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان،۱۹۶۵ء،ص ۱۳۳۔
۹) ''ابوالکلام آزاد غبارِ خاطر مکاتیب کی روشنی میں''، قاضی سراج الدین، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، ۱۹۶۶ء،ص ۲۵۷۔
۱۰) ''ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی علمی و ادبی خدمات''،شگفتہ نسرین،ڈاکٹر شاہ محمد نعیم ندوی،سن ندارد،ص ۷۶۔
۱۱) ''احسان دانش علمی و ادبی خدمات''،نسیم آرا سعید (سعدیہ نسیم) ڈاکٹر سیّد یحیٰ احمد ہاشمی،۱۹۷۵ء،ص ۲۸۴۔
۱۲) ''ڈاکٹر احسن فاروقی بحیثیت ناول نگار''،صلاح الدین،پروفیسر فہمیدہ شیخ،۱۹۹۱ء،ص ۱۲۸۔
۱۳) ''مولانا احسن مارہروی بحیثیت شاعر''،برجیس سلطانہ صدیقی،ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان،۱۹۶۷ء،ص ۳۷۵۔
۱۴) ''احمد ندیم قاسمی کے نظریاتی رجحانات''، مشتاق احمد خان (مشتاق قمر)، پروفیسر رابعہ اقبال، ۱۹۸۰ء،ص ۱۸۲۔
۱۵) ''اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں کی شاعری''،قدیر احمد خان،ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان،۱۹۶۸ء،ص ۱۰۸۔
۱۶) ''ڈاکٹر احمر رفاعی شخصیت و فن''،نغمہ صبور،پروفیسر فہمیدہ شیخ،۱۹۹۶ء،ص ۱۲۳۔
۱۷) ''اختر انصاری اکبرآبادی شخصیت و فن''،محمد انیس خان،عتیق احمد جیلانی،۱۹۸۸ء،ص ۲۰۸ (۳۸)
۱۸) ''اختر شیرانی کا اُردو شاعری میں مقام''،انوار احمد شیخ،۱۹۶۶ء،گمشدہ۔
۱۹) ''اداؔ جعفری شخصیت و فن''،محمد سلیم آرائیں،مرزا سلیم بیگ،۱۹۹۲ء،ص ۱۳۹۔
۲۰) ''ادیب رائے پوری شخصیت و فن''،سیّد شجاعت علی زیدی،ڈاکٹر سعدیہ نسیم،۱۹۹۷ء،گمشدہ۔
۲۱) ''ادیب سہیل ایک مطالعہ''،فرخندہ جمال،ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال،۲۰۰۰ء،ص ۱۵۸۔
۲۲) ''ارتضا عزمی شخصیت و فن''،عارفہ عشرت زئی،ڈاکٹر سعدیہ نسیم،۱۹۹۵ء،ص ۱۷۷۔
۲۳) ''ڈاکٹر سیّد اسعد گیلانی شخصیت و فن''،محمد سعید،عتیق احمد جیلانی،۱۹۹۶ء،ص ۱۹۰۔
۲۴) ''ڈاکٹر اسلم فرخی شخصیت و فن''،شہلا وحید،ڈاکٹر سعدیہ نسیم،۱۹۹۶ء،ص ۱۵۳۔
۲۵) ''اسمٰعیل احمد مینائی حیات و خدمات''،محمد عبداللطیف انصاری،ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال،۱۹۹۵ء،ص ۸۴۰۔

۲۶) ''اسمٰعیل میرٹھی اور اُن کی شاعری''، محفوظ احمد، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۱ء، ص ۱۰۷۔
۲۷) ''بچوں کی نفسیات اور اسمٰعیل میرٹھی''، رحمت النساء، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۷۰ء، ص ۱۹۷۔
۲۸) ''محمد اسمٰعیل میرٹھی کی شاعری اور اُن کا نظریہ تعلیم و تربیت''، محمد ایوب حسن، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، سنہ ندارد، ص ۱۱۸۔
۲۹) ''اسیر لکھنوی کا ادبی اور تحقیقی مطالعہ''، محمد افضل خان، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۱ء، ص ۱۲۵، گمشدہ۔
۳۰) ''مولانا اشرف علی تھانوی کا اُسلوب بہشتی زیور کی روشنی میں''، نظام الحق صدیقی، نگراں کا نام ندارد، ۱۹۶۷ء، ص ۸۴۔
۳۱) ''اصغر گونڈوی اور اُن کی شاعری''، محمد عامر فاروق، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، سنہ ندارد، ص ۲۱۹۔
۳۲) ''اصغر گونڈوی کی شاعری میں تصوف کے اثرات''، عائشہ سلطانہ، ڈاکٹر سردار احمد، ۱۹۶۷ء، ص ۱۰۶۔
۳۳) ''دیوانِ اعتصام الدولہ نادر کی تخمیسات کا تحقیقی مطالعہ''، خوشتر آراء، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۱۸۵۔
۳۴) ''اعجاز رحمانی کی نعتیہ شاعری''، سیّد شائستہ اصغر، عتیق احمد جیلانی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۱۷۔
۳۵) ''اعجاز جودھپوری شخصیت و فن''، ہنسارانی، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۱۹۹۵ء، ص ۹۴۔ (۳۹)
۳۶) ''اکبرالہٰ آبادی کے مذہبی و سیاسی رجحانات''، محمد مصباح الدین عثمانی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۵۹ء، ص ۴۵۵۔
۳۷) ''اکبر کی شاعری کا سیاسی پس منظر''، اشفاق احمد بخاری، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۳ء، ص ۲۴۰۔ (۴۰)
۳۸) ''اکبر کا سیاسی شعور''، نسیم اختر، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۵ء، ص ۲۹۴۔
۳۹) ''کلامِ اکبرالہٰ آبادی کا معاشرتی پس منظر''، سراج بانو رضوی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۲۸۵۔
۴۰) ''اکبرالہٰ آبادی کی شاعری کے فکری عناصر''، فرزانہ کوثر، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، سنہ ندارد، ص ۱۹۱
۴۱) ''خواجہ اکبر حسین اکبر اجمیری''، بدرالدین قریشی، ۱۹۶۷ء، گمشدہ۔
۴۲) ''مسلمانوں کے قومی مسائل اکبرالہٰ آبادی کی نظر میں''، محمد شمیم خان درّانی، ۱۹۶۴ء، گمشدہ۔
۴۳) ''اکرام تبسم احوال و آثار''، عبدالغفور ابنِ اسحاق، مرزا سلیم بیگ، ۲۰۰۴ء، ص ۱۲۳۔ (۴۱)
۴۴) ''الطاف فاطمہ شخصیت و فن''، ماجد علی، مرزا سلیم بیگ، ۱۹۹۳ء، ص ۸۱۔
۴۵) ''ڈاکٹر الیاس عشقی شخصیت و فن''، سیّد نگہت سیما زیدی، عتیق احمد جیلانی، ۱۹۹۹ء، ص ۲۵۳۔

۴۶) ''اُمراؤ طارق شخصیت وفن''، مہناز ضمیر، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۱۹۹۷ء، ص ۲۲۵۔ (۴۲)

۴۷) ''اُمید فاضلی شخصیت وفن''، رعنا ناہید رعنا، پروفیسر رابعہ اقبال، ۱۹۸۰ء، ص ۴۵۔

۴۸) ''امیر مینائی کی غزل میں لکھنوی شاعری کے عناصر''، ناہید مظفر، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، سنہ ندارد، ص ۱۶۵۔

۴۹) ''امیر مینائی کی نعتیہ شاعری''، سیّد عبدالوسیم، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، سنہ ندارد، ص ۱۷۹۔

۵۰) ''امیر مینائی کی نعتیہ شاعری''، شمس الرحمٰن خان، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۳ء، ص ۳۳۸۔

۵۱) ''انتظار حسین کے افسانے''، سعید الدین سعید، پروفیسر رابعہ اقبال، ۱۹۸۰ء، ص ۱۷۔

۵۲) ''انیس کے مرثیوں میں تاریخی واقعات''، شوکت علی، ۱۹۶۹ء، گمشدہ۔

۵۳) ''انور شعور شخصیت وفن''، عمران اللہ، مرزا سلیم بیگ، ۱۹۹۸ء، ص ۱۸۳۔

۵۴) ''مرثیۂ انیس کے نسوانی کردار''، شوکت سلطانہ صدیقی، گمشدہ۔

۵۵) ''کلامِ انیس میں ملکی رسم ورواج''، بلقیس وارثی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۶۸۔

۵۶) ''کلامِ انیس کا اخلاقی پہلو''، نسیم فاطمہ نقوی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۲۳۴۔

۵۷) ''مراثی انیس میں نسوانی کردار''، عزیز فاطمہ، گمشدہ۔

۵۸) ''ایم اسلم اور اُن کی ناول نگاری''، محمد حبیب صدیقی، (حبیب ارشد) ڈاکٹر سیّد یحیٰی احمد ہاشمی، ۱۹۷۳ء، ص ۱۱۲۔

۵۹) ''بانو قدسیہ شخصیت وفن''، عفت افضل، ڈاکٹر سعدیہ نسیم، ۱۹۹۳ء، ص ۱۷۲۔ (۴۳)

۶۰) ''بدر سا گری شخصیت وفن''، کشور جہاں، ڈاکٹر سعدیہ نسیم، ۱۹۹۷ء، ص ۳۲۸۔

۶۱) ''برگ یوسفی اور اُن کے تلامذہ''، سیّد صغیر الحسن روشن''، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۷۰ء، ص ۹۴۔

۶۲) ''دیوانِ بشیر کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ''، شمیم فاطمہ قادری، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۸۸۔

۶۳) ''بہادر شاہ ظفر کی غزل''، کنیز فاطمہ، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۶۳۔

۶۴) ''بہار کوٹی اور اُن کی خدمات''، انصار احمد، گمشدہ۔

۶۵) ''اُردو نعت میں بہزاد کا مرتبہ''، محمد صدیق صدیقی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۱ء، ص ۲۲۴۔ (۴۴)

۶۶) ''بیگم اختر ریاض الدین کے سفرنامے''، انیس عشرت، پروفیسر رابعہ اقبال، ۱۹۷۸ء، ص ۶۷۔

۶۷) ''کلامِ پروین کا تنقیدی جائزہ''، ناہید رخشاں صدیقی، ڈاکٹر سیّد یحیٰی احمد ہاشمی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۶۳۔

۶۸) ''پریم چند کے افسانے اور اُن کا معاشرتی پس منظر''، عبدالحمید شاہ، ۱۹۶۴ء، گمشدہ۔

۶۹) ''تاج قائم خانی شخصیت وفن''، شبیر احمد، مرزا سلیم بیگ، ۱۹۹۸ء، ص ۱۲۵۔

۷۰) ''علامہ تاجور کی ادبی خدمات''، شمیم پروین، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، سنہ ندارد، ص ۱۵۹۔

۷۱) ''جگر کا ذہنی ارتقاء''، احمد حسین خان (احمر رفاعی) ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۵۸ء، ص ۲۶۵۔
۷۲) ''جلیل احمد قدوائی شخصیت وفن''، شاہ انجم، عتیق احمد جیلانی، ۱۹۹۱ء، ص ۲۲۷۔ (۴۵)
۷۳) ''دوہا اور جمیل الدین عالی کا فن''، جمیل الرحمٰن عباسی (جمیل سوز)، مرزا سلیم بیگ، ۱۹۹۷ء، ص ۲۵۴۔
۷۴) ''جمیل زبیری ایک مطالعہ''، فائزہ عروج، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۲۰۰۵ء، ص ۱۱۶۔
۷۵) ''جوش اور انقلابی شاعری''، ممتاز سلیم، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۳ء، ص ۱۶۲۔
۷۶) ''جوہر سعیدی شخصیت وفن''، محمد طاہر، ڈاکٹر سعدیہ نسیم، ۱۹۹۸ء، ص ۲۹۳۔
۷۷) ''مولانا الطاف حسین حالی اور اصلاحِ معاشرہ''، بقاء اللہ خان، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۷ء، ص ۲۰۵۔
۷۸) ''حالی اور اصلاحِ ادب ایک جائزہ''، راشدہ اختر جمیل، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۸۹۔
۷۹) ''حالی ایک نقاد''، غوثیہ سلیم علوی، نگران کا نام ندارد، ۱۹۶۶ء، ص ۷۰۔
۸۰) ''حالی بحیثیت سوانح نگار''، سیّد باقر رضا، پروفیسر قاضی مرتضٰی، ۱۹۵۴ء، گمشدہ۔
۸۱) ''حالی پر سرسیّد کے سیاسی اور ادبی اثرات''، شرف الدین اصلاحی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۱ء، ص ۳۵۱ (۴۶)
۸۲) ''تحریکِ اصلاح میں حالی کا کردار''، طاہر تسنیم، ظفر عابدی، ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۳۔
۸۳) ''خواجہ الطاف حسین حالی کا نظریۂ تعلیم''، مصحرہ رشید، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۸ء، ص ۱۸۲۔
۸۴) ''حالی کی غزل''، محمد عارف قریشی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۰۴۔
۸۵) ''حالی کی جدید شاعری''، ملکہ خانم، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، سنہ ندارد، ص ۱۳۸۔
۸۶) ''مولانا الطاف حسین حالی کی زبان''، اورنگ زیب خان، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۸ء، ۶۳۔
۸۷) ''حالی کی قومی شاعری اور اس کا پس منظر''، قمر الدین، ۱۹۶۴ء، گمشدہ۔
۸۸) ''حالی کی نظموں کا معاشرتی پس منظر''، افتخار جبیں، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۸ء، ص ۱۶۶۔
۸۹) ''حالی کی منظومات کا ثقافتی پس منظر''، محمد عمر خان برقی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۸ء، ص ۱۰۹۔
۹۰) ''نواب حبیب الرحمٰن خان شیروانی کی ادبی خدمات''، شمیم محمد خان شیروانی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۴ء، گمشدہ
۹۱) ''حسرت اور اُن کا نظریۂ غزل''، حسن محمد خان، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۵ء، ص ۱۳۴۔
۹۲) ''حسرت کا سیاسی شعور''، سیّد محمد عتیق الدین جاوید، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۷ء، ص ۸۷۔

۹۳) ''حسرت موہانی اور اُن کے حیات و کارنامے''، سید افضال احمد، بخاری، ڈاکٹر نجم الاسلام، ۱۹۸۷ء، ص ۱۶۸۔
۹۴) ''حشمت حسین حشمت جعفری شخصیت و فن''، حیاتِ فرید، ڈاکٹر سعیدیہ نسیم، ۲۰۰۳ء، ص ۲۵۳۔
۹۵) ''حضور احمد سلیم شخصیت و فن''، رونق افروز صدیقی، عتیق احمد جیلانی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۴۴ (۴۷)۔
۹۶) ''حفیظ جالندھری اور اُن کا کلام''، عابد علی خان یوسف زئی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۶۷۔
۹۷) ''حفیظ جالندھری اور اُن کی شاعری''، ساجدہ ابراہیم، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ۱۹۱۷ء، ص ۱۰۹۔
۹۸) ''حمایت علی شاعر شخصیت و فن''، رشید احمد، ڈاکٹر سید جاوید اقبال، ۱۹۹۴ء، ص ۲۳۴۔
۹۹) ''حمید عظیم آبادی جانشین شاد عظیم آبادی''، ناصر بدایونی، ڈاکٹر اسرار احمد خان، ۱۹۷۲ء، ص ۱۰۴۔
۱۰۰) ''حیدر دہلوی''، حاجرہ خانم، ۱۹۶۹ء، گمشدہ۔
۱۰۱) ''خدیجہ مستور کا آنگن''، ریحانہ طلعت خان، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۲۰۳۔
۱۰۲) ''خواجہ حسن نظامی کی حیات اور ادبی کارنامے''، ذکائی شکیلہ پروین، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۱۰۹۔
۱۰۳) ''خواجہ رضی حیدر شخصیت و فن''، الطاف حسین، مرزا سلیم بیگ، ۱۹۹۳ء، ص ۲۰۸۔
۱۰۴) ''خواجہ شمس الدین عظیمی علمی و ادبی خدمات''، ثوبیہ کرن، پروفیسر فہمیدہ شیخ، ۲۰۰۲ء، ص ۱۴۴۔
۱۰۵) ''داغ اور تلامذۂ داغ''، طاہرہ خاتون، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، سنہ ندارد، ص ۹۴۔
۱۰۶) ''داغ کی انفرادیت''، ہاجرہ عبدالغفور، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۶۔
۱۰۷) ''داغ دہلوی کا ایک گمنام شاگرد حیران شکوہ آبادی''، محمد شمیم خان، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۷۱ء، ص ۱۳۴۔
۱۰۸) ''داغ کی شاعری میں اُن کے زمانے کا معاشرہ''، کنیز فاطمہ جعفری، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۵ء، ص ۱۸۶۔
۱۰۹) ''مراثیِ دبیر میں ڈرامائی عناصر''، شہزاد بانو، ڈاکٹر خان رشید، ۱۹۶۵ء، ص ۱۷۴۔
۱۱۰) ''کلامِ درد کا مواد اور ہیئت''، اقبال شاہین، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۹۔
۱۱۱) ''درد سعیدی شخصیت و فن''، جمیل احمد، ڈاکٹر سعدیہ نسیم، ۱۹۹۶ء، ص ۳۳۷۔
۱۱۲) ''کلامِ ذوق میں تشبیہات''، رب نواز، ۱۹۶۸ء، گمشدہ۔
۱۱۳) ''راشد الخیری کے ناولوں کا سماجی پس منظر''، محمد حیات اللہ خان، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۲۰۶۔
۱۱۴) ''راشد الخیری اور تعلیم نسواں''، بشریٰ بشیر چوہدری، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۲۹۶۔
۱۱۵) ''راشد الخیری کے یہاں عورت کا مرتبہ''، رضیہ سلطان زیدی، ۱۹۶۴ء، گمشدہ۔

۱۱۶) ''رائے گلاب چند ہمدم دکنی اور شاہ نصیر''، نشاط فاطمہ، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، سنہ ندارد، ص ۱۰۱۔
۱۱۶) ''رحمان کیانی حیات وفن''، نوید الاسلام (نوید سروش)، عتیق احمد جیلانی، ۱۹۹۱ء، ص ۲۹۸۔
۱۱۷) ''مولانا رزمی جے پوری حالاتِ زندگی اور شاعری''، سیّدہ مومنہ مشتاق، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۲۸۱۔
۱۱۸) ''مولانا رزمی جے پوری حالاتِ زندگی اور شاعری''، سیّدہ محسنہ خاتون، (ڈاکٹر محسنہ نقوی) پروفیسر رابعہ اقبال، ۱۹۷۹ء، ص ۸۳۔
۱۱۹) ''سیّد مرزا رسوا کی کردار نگاری''، ساجد حسین زیدی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۰۸۔
۱۲۰) ''مرزا محمد ہادی رسوا کے ناولوں میں لکھنوی معاشرہ''، عصمت سلطانہ، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۳۵۶۔
۱۲۱) ''رشید احمد صدیقی اور اُن کی طنز نگاری''، عبدالقیوم، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۰۵۔
۱۲۲) ''رشید احمد صدیقی بحیثیت خاکہ نگار''، قمر النساء خان، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۳ (۴۸)
۱۲۳) ''رشید احمد صدیقی کا طنز و مزاح''، علی اختر جعفری، نگراں کا نام ندارد، ۱۹۶۷ء، ص ۴۷۔
۱۲۴) ''رشید احمد صدیقی کی ادبی خدمات''، محمد زبیر صدیقی، گمشدہ۔
۱۲۵) ''رشید احمد صدیقی کی ادبی خدمات''، نسیم اختر، ۱۹۶۵ء، گمشدہ۔
۱۲۶) ''رئیس امروہوی بحیثیت شاعر''، مسعود الرحمٰن، مرزا سلیم بیگ، ۱۹۹۳ء، ص ۱۰۸ (۴۹)
۱۲۷) ''زاہدہ حنا شخصیت وفن''، کنول رعنا، ڈاکٹر سعدیہ نسیم، ۱۹۹۷ء، ص ۱۱۴۔
۱۲۸) ''ڈاکٹر زور اور اُن کی خدمات''، طاہر رشید فاروقی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۹۲۔
۱۲۹) ''ساحر لدھیانوی فن اور شخصیت کے آئینے میں''، حنیف بھولو شیخ، مرزا سلیم بیگ، ۱۹۹۷ء، ص ۱۱۰۔
۱۳۰) ''ساحر لکھنوی حیات و خدمات''، سیّد ضمیر حیدر نقوی، مرزا سلیم بیگ، ۲۰۰۲ء، ص ۳۶۷۔
۱۳۱) ''سجاد حیدر یلدرم کے حالاتِ زندگی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات''، رفیق احمد انصاری، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۸۔
۱۳۲) ''سرسیّد کا طنز و مزاح''، اقبال احمد خان، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۱ء، ص ۱۹۳۔
۱۳۳) ''سرسیّد احمد خان کا سیاسی شعور''، انجم سلطانہ، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۳۴۱۔
۱۳۴) ''مضامینِ سرسیّد کی زبان''، محمد حنیف شیخ، نگران کا نام ندارد، ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۸۔
۱۳۵) ''سرسیّد اور علم الاخلاق''، عبدالرفیق شیخ، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۷۵ (۵۰)

۱۳۹) خان اپنی تعلیمات کی روشنی میں''، انیس ابراہیم، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، سنہ ندارد، ص ۲۲۶۔
۱۴۰) ''سفیر گلشن آبادی مرحوم شخصیت وفن''، غلام مصطفٰے، پروفیسر فہمیدہ شیخ، ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۲۔
۱۴۱) ''سلطان جمیل نسیم فن اور شخصیت''، وجیہ الحسن صدیقی، پروفیسر فہمیدہ شیخ، ۱۹۹۶، ص ۱۲۱۔
۱۴۲) ''سلیم احمد ایک مطالعہ''، مرزا سلیم بیگ، پروفیسر رابعہ اقبال، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۹ (۵۲)
۱۴۳) ''سلیم جعفر احوال وآثار''، فرحت سپنا، ڈاکٹر سعدیہ نسیم، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۹۔
۱۴۴) ''سودا کے ہندی الفاظ ومحاورات''، سیّد مبارک علی، ۱۹۶۸ء، گمشدہ۔
۱۴۵) ''مولانا سیّد سلیمان ندوی کا علمی وادبی شعور''، عبدالمستقیم خان، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۷۰ء، ص ۹۸۔
۱۴۶) ''سیّد سلیمان ندوی کی علمی وادبی خدمات ایک جائزہ''، سیّد معظم علی، ۱۹۶۴ء، گمشدہ۔
۱۴۷) ''سیّد سلیمان ندوی کے شذرات''، نسیم اختر چوہدری، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۱۸۔
۱۴۸) ''سیّد سلیمان ندوی کے تبصرے''، مس نسیم مرزا، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، سنہ ندارد، ص ۱۴۴۔
۱۴۹) ''سیّد سلیمان ندوی کے تنقیدی مضامین''، معین الدین شیخ، ۱۹۶۶ء، گمشدہ۔
۱۵۰) ''خان زادہ سمیع الوری شخصیت وفن''، اسرار الحق خان زادہ، عتیق احمد جیلانی، ۲۰۰۱ء، ص ۲۱۵۔ (۵۳)
۱۵۱) ''سودا کا ادبی ماحول اُن کے کلام کے آئینے میں''، شاہینہ نسرین، ڈاکٹر اسرار احمد، ۱۹۶۸ء، ص ۵۳۔
۱۵۲) ''تذکرہ سہا''، حکیم رفیق خان، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۷۰ء، ص ۳۰۹۔
۱۵۳) ''سیماب کی جدّت طرازیاں''، حبیب زہرہ، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، سنہ ندارد، ۲۳۶۔
۱۵۴) ''مطالعہ کلامِ شاد (بہوٹی)''، آنسہ نگہت خورشید، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۷۵ء، ص ۱۳۳۔
۱۵۵) ''شاد عظیم آبادی اور اُن کی شاعری''، نجمہ اشتیاق، نگراں کا نام ندارد سنہ، ندارد، ص ۵۶۔
۱۵۶) ''ڈاکٹر شان الحق حقی''، فرحت سعیدی، پروفیسر فہمیدہ شیخ، ۱۹۹۷ء، ص ۴۰۹۔
۱۵۷) ''شاہد احمد دہلوی کے ادبی مضامین''، قمر علی عباسی، ۱۹۶۶ء، گمشدہ۔
۱۵۸) ''شاہد احمد دہلوی کی زبان''، طاہرہ پروین، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۷۱ء، ص ۱۱۳۔
۱۵۹) ''شاہد نقوی کی مرثیہ نگاری''، کنول بتول، عتیق احمد جیلانی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۹۹۔

۱۶۰) ''شبلی اپنے خطوط کے آئینے میں''، سیّد برکت علی، ۱۹۶۸ء، گمشدہ۔

۱۶۱) ''شبلی بحیثیت سوانح نگار''، محمد نصیر الدین، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۵۸ء، ص ۱۰۷۔

۱۶۲) ''شبلی کا تنقیدی شعور''، محمد اسحاق شمس، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۳ء، ص ۱۷۲۔ (۵۴)

۱۶۳) مولانا شبلی کے اُردو، فارسی کلام کا تقابلی مطالعہ''، عبدالسبحان خان، ڈاکٹر سیّد یحیٰی احمد ہاشمی، ۱۹۶۴ء، ص ۲۸۵۔

۱۶۴) ''شبلی کا سیاسی شعور''، انور محی الدین انصاری، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۵ء، ص ۱۷۲۔

۱۶۵) ''شبلی کی سیرت نگاری''، افتخار احمدی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، سنہ ندارد، ص ۱۸۵۔

۱۶۶) ''مکاتیب شبلی کی اہمیت اُردو ادب میں''، معین الدین انصاری، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۵۶ء، گمشدہ (۵۵)

۱۶۷) ''شبلی کا طنز و مزاح''، نرگس زیدی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، سنہ ندارد، ص ۲۲۳۔

۱۶۸) ''شبلی کی شعر گوئی اور شعر فہمی''، عابدہ قریشی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، سنہ ندارد، ص ۱۰۳۔

۱۶۹) ''شعر العجم میں شبلی کا تنقیدی اُسلوب''، زرینہ خاتون، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۸ء، ص ۹۸۔

۱۷۰) ''شرر کا انشائی ادب''، نربھے رام جوہر (نعیم الرحمٰن جوہر) ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۵ء، ص ۲۱۵۔ (۵۶)

۱۷۱) ''تاریخی ناول نگاری میں شرر کا مقام''، نظام الدین قریشی، ۱۹۶۵ء، گمشدہ۔

۱۷۲) ''عبدالحلیم شرر کی کردار نگاری''، ثقلین فاطمہ نقوی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۸۵۔

۱۷۳) ''شرر کی منظر نگاری''، کرار حسین سیّد، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، سنہ ندارد، ص ۱۱۷۔

۱۷۴) ''شفقت رضوی کی حسرت شناسی''، عشرت مرتضٰی، پروفیسر فہمیدہ شیخ، ۲۰۰۲ء، ص ۱۸۲ (۵۷)

۱۷۵) ''ڈاکٹر شمس الدین صدیقی''، امتیاز بی بی، ڈاکٹر نجم الاسلام، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱۲۔

۱۷۶) ''شوق قدوائی کی حیات و شاعری''، فریدہ خاتون نقوی، ڈاکٹر اسرار احمد، ۱۹۶۷ء، ص ۱۵۴۔

۱۷۷) ''شوکت تھانوی ایک جائزہ''، محمد صادق بیگ، ۱۹۶۵ء، گمشدہ۔

۱۷۸) ''شوکت صدیقی شخصیت و فن''، محمد علی، (محمد علی منظر) مرزا سلیم بیگ، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۸۔

۱۷۹) ''شیخ ایاز شخصیت و فن''، (خصوصی مطالعہ بہ حوالہ اُردو تراجم) اختر کشمیری، ڈاکٹر سعدیہ نسیم، ۲۰۰۲ء، ص ۱۶۶۔

۱۸۰) ''ڈاکٹر صابر آفاقی حیات و خدمات''، رخسانہ شمسی، عتیق احمد جیلانی، ۲۰۰۱ء، ص ۹۶۔

۱۸۱) ''سیّد محمد صادق علی صادق دہلوی شخصیت و فن''، شکیل احمد خان، عتیق احمد جیلانی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۸۶۔ (۵۸)

۱۸۲) ''صبا اکبر آبادی کی نعتیہ شاعری''، نجمہ رؤف، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۲۰۰۰ء، ص ۱۵۰۔(۵۹)
۱۸۳) ''صغیر ملال فن اور شخصیت''، غلام مصطفےٰ، عتیق احمد جیلانی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۶۶۔
۱۸۴) ''صفدر علی صفدر مرزا پوری''، (ایک مطالعہ) غیاث احمد، پروفیسر رابعہ اقبال، ۱۹۹۳ء، ص ۲۰۲۔
۱۸۵) ''ادبیاتِ اُردو کے فروغ میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کا کردار''، صدف سلطانہ، پروفیسر فہمیدہ شیخ، ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۸۔
۱۸۶) ''مولانا ظفر علی خان کا قومی وسیاسی شعور''، عبدالجبار یوسفی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۰ء، ص ۲۳۹، گمشدہ۔
۱۸۷) ''مولانا ظفر علی خان کی شاعری میں طنز ومزاح''، نسیم نظر عسکری، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۳ء، ۲۶۶(۶۰)۔
۱۸۸) ''کلامِ ظفر علی خاں کا سیاسی وسماجی پس منظر''، افتخار احمد خاں، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۶۷۔
۱۸۹) ''کلامِ ظفر کا معاشرتی پس منظر''، نسرین اختر چوہدری، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۸۷۔
۱۹۰) ''مولانا ظفر علی خان بحیثیت شاعر وصحافی''، ڈاکٹر حسنین زیدی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۷۰ء، ص ۴۹۱۔
۱۹۱) ''مولانا ظفر علی خان کی شاعری کا سیاسی پس منظر''، مہر افروز، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، سنہ ندارد، ص ۱۹۹۔
۱۹۲) ''مولانا ظفر علی خان کی قومی شاعری''، سیّد منیر احمد، گمشدہ۔
۱۹۳) ''مولانا ظفر علی خان کی شاعری میں سیاسی تلمیحات''، افتخار احمد خان، گمشدہ۔
۱۹۴) ''سیّد عارف لکھنوی فن اور شخصیت''، محمد عارف رندھاوا، ڈاکٹر سعدیہ نسیم، ۱۹۹۳ء، ص ۹۱۔
۱۹۵) ''مولوی عبدالحق اپنے خطوط کے آئینے میں''، سردار بہادر، گمشدہ۔
۱۹۶) ''ڈاکٹر عبدالحق کی ادبی خدمات''، چوہدری محمد صدرالدین، گمشدہ۔
۱۹۷) ''خطباتِ عبدالحق کا سیاسی پس منظر''، سردار اختر، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، سنہ ندارد، ص ۱۵۴۔
۱۹۸) ''عبدالحق کا طنز ومزاح'' نورالنہار افضل، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۴۹۔
۱۹۹) ''ڈاکٹر عبدالحق حسرت کاسگنجوی شخصیت وفن''، عظمیٰ خان، ڈاکٹر سعدیہ نسیم، ۱۹۹۶ء، ص ۲۹۸
۲۰۰) ''عزیز احمد کی ناول نگاری''، حشمت اللہ، ۱۹۶۵ء، گمشدہ۔
۲۰۱) ''عبدالوحید نزنگ''، بشیر احمد، ۱۹۶۹ء، گمشدہ۔
۲۰۲) ''قدرِ مجذوب حضرت عزیز الحسن غوری مجذوب کی شخصیت وفن''، سیّد مظہر عاصم، ڈاکٹر سردار احمد، ۱۹۶۸ء، ص ۷۵۔
۲۰۳) ''پروفیسر عزیز جبران انصاری فن اور شخصیت''، شیرین قمر صدیقی، عتیق احمد جیلانی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۳۱۔
۲۰۴) ''عصمت چغتائی افسانہ نگار کی حیثیت سے''، عشرت جاوید، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، سنہ ندارد، ص ۱۴۶۔

۲۰۵) ''عظیم عباسی اور مزاحیہ شاعری''، نجمہ نسیم، ڈاکٹر سیّد یحییٰ احمد ہاشمی، ۱۹۷۵ء، ص ۱۲۸۔

۲۰۶) ''پروفیسر عنایت علی خان ٹونکی شخصیت وفن''، شمشیر علی قائم خانی، ڈاکٹر سعدیہ تسنیم، ۱۹۹۳ء، ص ۱۳۰۔

۲۰۷) ''ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے خطوط پروفیسر مسعود احمد کے نام''، شاہجہاں خانم، ڈاکٹر محمد مسعود، ۱۹۸۰ء، ص ۲۱۰۔

۲۰۸) ''ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے مکتوبات کا ایک جائزہ''، فرحانہ شیخ، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۱۹۹۸ء، ص ۲۵۲۔

۲۰۹) ''ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں بحیثیت اقبال شناس''، نجم النساء صدیقی، پروفیسر رابعہ اقبال، ۱۹۸۱ء، ص ۱۶۵۔

۲۱۰) ''ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے مقدمات''، طارق حسین طارق، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۸۳ء، گمشدہ (۶۱)

۲۱۱) ''مشاہیر کے خطوط ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے نام''، سیّد خضر حیات، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۲۳۳۔ (۶۲)

۲۱۲) ''فانی اور اُن کی شاعری''، جامعی محمد عبدالرحمٰن، پروفیسر قاضی مرتضیٰ، ۱۹۵۴ء، ص ۹۹۔

۲۱۳) ''ڈاکٹر فردوس انور قاضی شخصیت وفن''، صدف نسیم، ڈاکٹر سعدیہ نسیم، ۲۰۰۳ء، ص ۱۶۴۔

۲۱۴) ''فردوس حیدر شخصیت وفن''، پروین شیخ، ڈاکٹر سعدیہ تسیم، ۱۹۹۷ء، ص ۳۰۲۔

۲۱۵) ''فضل احمد کریم فضلی اور اُن کا فن''، سیّد جاوید اقبال، پروفیسر رابعہ اقبال، ۱۹۸۷ء، ص ۱۰۶ (۶۳)

۲۱۶) ''فقیر محمد گویا احوال وآثار''، نزہت آرا، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۷۱ء، گمشدہ۔

۲۱۷) ''فن دہلوی، احوال وآثار''، صائمہ بشیر، مرزا سلیم بیگ، ۲۰۰۵ء، ص ۹۹۔

۲۱۸) ''فیض احمد فیض کی شاعری میں طبقاتی کشمکش''، غلام حسین صمدانی، عتیق احمد جیلانی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۰۳۔

۲۱۹) ''قابل اجمیری حالات زندگی اور شاعری''، سیّد محمد تسلیم، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۳۲۵۔

۲۲۰) ''کلام قدرت کا تحقیقی مطالعہ''، محمد شمس الحق قریشی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۱۴۳۔

۲۲۱) ''قمر علی عباسی شخصیت وفن''، شفیق الرحمٰن، مرزا سلیم بیگ، ۱۹۹۶ء، ص ۳۷۶۔

۲۲۲) ''کرشن چندر بحیثیت افسانہ نگار''، اقبال نفیس، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، سنہ ندارد، ص ۱۵۶۔

۲۲۳) ''ڈاکٹر کریم الدین احمد حیات وخدمات''، عرفان علی، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۲۰۰۱ء، ص ۱۶۱۔

۲۲۴) ''ماہر القادری بحیثیت شاعر''، رخشندہ خورشید، ڈاکٹر خان رشید، ۱۹۷۱ء، ص ۱۱۱۔

۲۲۵) ''ماہر القادری فاران کی روشنی میں''، انوار احمد زئی، ۱۹۶۶ء، گمشدہ۔

۲۲۶) ''ماہر کی غزل''، کرار احمد خان زادہ، ڈاکٹر نجم الاسلام، ۱۹۸۸ء، ص ۱۲۹۔

۲۲۷)''ماہرالقادری کی لسانی تصریحات''، سیما اشفاق، پروفیسر رابعہ اقبال،۱۹۹۲ء،ص ۱۳۶۔(۶۴)۔
۲۲۸)''لکھنوی شاعری میں محسن کاکوروی کا درجہ''محمد ادریس، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان،۱۹۶۱ء،ص ۱۸۶۔
۲۲۹)''محسن کاکوروی کے کلام پر قرآن و حدیث کے اثرات''، محمد عثمان، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۵ء، ص ۱۰۴۔
۲۳۰)''ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل کی ادبی خدمات''، سرور جمال، ڈاکٹر نجم الاسلام،۱۹۸۱ء، ص ۱۰۸۔
۲۳۱)''محمد حسن عسکری کے نظریاتی رجحانات''، راجہ فیض الحسن، پروفیسر رابعہ اقبال،۱۹۷۸ء، ص ۸۷۔
۲۳۲)''محمد حسین آزاد بحیثیت تنقید نگار''، حسین بانو، قاضی محمد مرتضیٰ، ۱۹۵۵ء، ص ۸۴۔
۲۳۳)''محمد حسین آزاد کا نظریۂ شعروادب''، ثریا محمود قریشی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان،۱۹۶۵ء، ص ۱۷۵۔
۲۳۴)''کرنل محمد خاں کے سفرناموں کا تنقیدی جائزہ''، عذرا صغیر احمد، فہمیدہ شیخ،۲۰۰۴ء، ص ۱۱۰۔
۲۳۵)''مولانا محمد علی جوہر شاعروصحافی''، غلام غوث، پروفیسر سردار احمد،۱۹۷۱ء، ص ۱۲۲۔
۲۳۶)''حافظ محمود شیرانی بحیثیت محقق''محمد عزیز خان، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان،۱۹۶۶ء، ص ۱۳۷۔(۶۵)
۲۳۷)''مولانا محمد علی جوہر بحیثیت ادیب وشاعر''، سیّد مسعود علی، پروفیسر رابعہ اقبال،۱۹۹۵ء، ص ۱۳۸۔
۲۳۸)''مرزا ادیب اوراُن کے ڈرامے''، فردوس تبسم، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ص ۱۹۶۵ء، ص ۱۱۲۔
۲۳۹)''مرزا قلیچ بیگ کی اُردو خدمات''، ریاض احمد خان زادہ، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان،۱۹۷۱ء، ص ۱۱۳۔
۲۴۰)''مرزا فرحت اللہ بیگ''، سیّد رسول، گمشدہ۔
۲۴۱)''مرزا عزیز بیگ کی تضمین نگاری''، شوکت حسین، گمشدہ۔
۲۴۲)''مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں کا تنقیدی جائزہ''، رخسانہ بلوچ، فہمیدہ شیخ،۲۰۰۴ء، ص ۹۰۔
۲۴۳)''ڈاکٹر معین الدین عقیل کی علمی و ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ''، شائلہ فریدالدین، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۱۹۹۷ء، ص ۳۱۹۔
۲۴۴)''ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی شخصیت وفن''، مرزا اسلیم بیگ،۲۰۰۳ء، ص ۱۵۳۔
۲۴۵)''ممتاز مفتی بحیثیت افسانہ نگار''، انعام الحق عباسی، ڈاکٹر سعدیہ نسیم،۱۹۹۱ء، ص ۱۲۸۔
۲۴۶)''مناظر حسن گیلانی''، محمد شباب،۱۹۶۹ء، گمشدہ۔
۲۴۷)''شیخ منظور الٰہی شخصیت وفن''، شازیہ یاسمین، پروفیسر فہمیدہ شیخ،۱۹۹۹ء، ص ۲۶۳۔
۲۴۸)''منیر شکوہ آبادی''، عبدالحکیم خان،۱۹۶۵ء، گمشدہ۔
۲۴۹)''مطالعات میر''، محمد صدیق (صدیق ہمایوں) عتیق احمد جیلانی،۱۹۹۲ء، ص ۱۱۲۔

۲۵۰) ''میر تقی میر کی زبان''، رضیہ بانو زیدی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۵ء، ص ۱۹۵۔

۲۵۱) ''میر دوست خلیل آثار و افکار''، فرحانہ حسن، گمشدہ۔

۲۵۲) ''کلامِ میر حیات میر کے نقوش''، کلثوم بیگم، حسن محمد خان، ۱۹۶۸ء، ص ۱۰۹۔

۲۵۳) ''میر کے منظوم قصے''، حسین بانو نقوی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۸ء، ص ۱۴۶۔

۲۵۴) ''میر کی شاعری اور اس کا معاشرتی پس منظر''، سیّد شفیق احمد قادری، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۵ء، ص ۸۱۔

۲۵۵) ''میر کے کلام میں ادبی ماحول'' انجمن آرا، گمشدہ۔

۲۵۶) ''میر کی شاعری کا معاشرتی پس منظر''، غیور احمد صدیقی، ۱۹۶۹ء، گمشدہ۔

۲۵۷) ''میر علی نواز خان تالپور والیِ ریاست تالپور اور اُس کی شاعری''، محمد حداد حاجی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۸ء، ص ۴۵۔

۲۵۸) ''میر مہدی مجروحؔ ادبی و تحقیقی مطالعہ''، مختار احمد صدیقی (مختار کریمی) ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۱ء، ص ۱۰۲۔

۲۵۹) ''ڈپٹی نذیر احمد مرحوم میری نظر میں''، شوکت علی، پروفیسر قاضی مرتضٰی، ۱۹۵۴ء، ص ۹۳۔

۲۶۰) ''نذیر احمد کا ذہنی ارتقاء''، محمد منیر الدین عرشی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۵۹ء، ص ۲۲۶۔

۲۶۱) ''ڈپٹی نذیر احمد کے اصلاحی رجحانات''، شمس النساء مجید، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۵ء، ص ۳۵۵۔

۲۶۲) ''نذیر احمد کی کردار نگاری''، کوکب الصباح روحی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۸۴۔

۲۶۳) ''ڈپٹی نذیر احمد اور تعلیمِ نسواں''، عمران فاطمہ عابدی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۸ء، ص ۱۵۳۔

۲۶۴) ''مولانا ڈپٹی نذیر احمد کا ادبی و مذہبی شعور''، صفیہ خاتون میمن، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۳ء، ص ۳۲۲ (۶۶)۔

۲۶۵) ''شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد کی ادبی و مذہبی خدمات''، ممتاز کریم صدیقی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۷۱ء، ص ۱۸۶۔

۲۶۶) ''ڈپٹی نذیر احمد کے محاورات''، احسان الحق، گمشدہ۔

۲۶۷) ''نذیر احمد کے ناولوں کی مقصدیت''، مرزا محمد جلیل، ۱۹۶۵ء، گمشدہ۔

۲۶۸) ''تاریخی ناول نگاری اور نسیم حجازی''، ظفر اقبال، ڈاکٹر سیّد یحیٰی احمد ہاشمی، ۱۹۷۵ء، ص ۳۱۰

۲۶۹) ''نسیم حجازی بحیثیت ناول نگار''، عبداللہ قریشی، گمشدہ۔

۲۷۰) ''نظیر اکبر آبادی کا نظریۂ شاعری''، صفدر حسین، ۱۹۶۵ء، گمشدہ۔

۲۷۱)''نظیر اکبرآبادی اور اُن کی زبان''، زاہد علی قریشی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۵ء، ص ۱۶۳۔
۲۷۲)''شیخ ولی محمد نظیر اکبرآبادی کی شاعری کا تجزیہ''، مقالہ نگار کا نام ندارد، گمشدہ۔
۲۷۳)''شیخ ولی محمد نظیر اکبرآبادی کی شاعری کا عوامی پہلو''، شیخ سلام الدین جاوید، ۱۹۶۵ء، گمشدہ۔
۲۷۴)''نظیر اکبرآبادی کے کلام میں عوامی جذبات''، صدیقہ خاتون، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۷۱ء، ص ۱۲۷۔
۲۷۵)''نظیر کی شاعری میں جمہوری اقدار''، رابعہ بصری، پروفیسر سردار احمد خان، ۱۹۶۷ء، ص ۷۸۔
۲۷۶)''نظیر اکبرآبادی کے کلام میں ملکی روایات''، سیّد میر، گمشدہ۔
۲۷۷)''نعیم صدیقی کے نظریاتی رجحانات تخلیقات کے آئینے میں''، عتیق احمد جیلانی، پروفیسر رابعہ اقبال، ۱۹۷۸ء، ص ۱۰۷۔
۲۷۸)''نوح ناروی حیات اور شاعری''، سبط حسن، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۷۳ء، ص ۱۸۳۔
۲۷۹)''نہالؔ اجمیری اور اُن کے تلامذہ''، محمد سرفراز خان، ڈاکٹر سیّد یحییٰ احمد ہاشمی، ۱۹۷۴ء، ص ۱۱۳۔
۲۸۰)''نہالؔ سیوہاری اور اُن کا کلام''، عبدالغفور، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۵۔
۲۸۱)''نیاز فتح پوری کا انشائی ادب''، عبدالسعید خان، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۵۴۔
۲۸۲)''وجہی کے زمانے کی معاشرت''، فردوس اختر، ڈاکٹر خان رشید، ۱۹۶۸ء، ص ۱۲۰۔
۲۸۳)''وحشتؔ کی ادبی خدمات''، عبدالستار (وفا راشدی) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۵ (۶۷)۔
۲۸۴)''وضاحت نسیم شاعری اور شخصیت''، سائرہ خان، عتیق احمد جیلانی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۰۴۔
۲۸۵)''افسانہ اور ہاجرہ مسرور''، محمد طاہر، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۰۴۔
۲۸۶)''ہادیؔ مچھلی شہری کی اُردو شاعری''، صابر صدیقی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۱۲۰۔

۲۔ ''اقبالیات''

۲۸۷)''اقبالؔ اپنے خطوط کے آئینے میں''، سیّد محمد عارف، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۷۲۔
۲۸۸)''اقبالؔ اور وطنیت''، محمد شریف، گمشدہ۔
۲۸۹)''ڈاکٹر محمد اقبالؔ اور مسلم مفکرین''، طلعت پروین، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۶۔
۲۹۰)''اقبالؔ اور مسلم مفکرین''، زہرہ رحمان، گمشدہ۔
۲۹۱)''اقبالؔ بحیثیت غزل گو''، سیّد مختار علی سحر، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، سنہ ندارد، ص ۸۲۔
۲۹۲)''اقبالؔ بحیثیت قومی شاعر''، محمد اقبال قادری، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۷۵۔
۲۹۳)''اقبالؔ بحیثیت شاعرِ مشرق''، رفعت علی خان، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۵۶ء، ص ۲۵۷۔

۲۹۴)''اقبالؔ کے کلام میں تشبیہات واستعارات''،شہناز اعجاز صدیقی ،ڈاکٹر سیّد یحییٰ احمد ہاشمی ،۱۹۷۲ء،ص ۱۱۰۔
۲۹۵)''اقبالؔ کے اُردو کلام میں تشبیہات واستعارات''،نسیم فاطمہ،ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان،۱۹۷۴ء،ص ۳۱۰۔
۲۹۶)''اقبالؔ کی اُردو شاعری پر فارسی شعرا کے اثرات''، عارفہ یاسمین،ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان،۱۹۶۶ء،ص ۲۴۱۔
۲۹۷)''اقبالؔ کی شاعری کا سیاسی پس منظر''،اقبال احمد،ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان،۱۹۶۶ء،ص ۱۴۹۔
۲۹۸)''اقبالؔ کا ذہنی ارتقاء''،(مکاتیب کی روشنی میں)نصرت رحیم،قاضی مرتضیٰ،۱۹۵۶ء،گمشدہ۔
۲۹۹)''اقبالؔ کی قومی شاعری اور پاکستان کے قومی مسائل''،محمد افضل صدیقی،گمشدہ۔
۳۰۰)''اقبالؔ کا نظریۂ شعروادب''،عمر بن محمد،ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان،۱۹۶۵ء،ص ۱۵۳۔
۳۰۱)''اقبالؔ کی لفظ تراشی''،محمد عارف جمال،گمشدہ۔

۳۔ ''غالبیات''

۳۰۲)''غالبؔ بحیثیت سوانح نگار''،سیّد باقر رضا،پروفیسر قاضی مرتضیٰ،۱۹۵۴ء،ص ۱۳۵۔
۳۰۳)''مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کے اُردو فارسی کلام کا تقابلی مطالعہ''،شمس الحق شمس بخاری،نگراں کا نام ندارد،
۱۹۶۶ء،ص ۹۵۔
۳۰۴)''غالبؔ کے اثرات شعرا مابعد پر''، عابدہ رشید جہاں،ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان،۱۹۶۰ء،ص ۲۵۸،
گمشدہ۔
۳۰۵)''غالبؔ کی شاعری پر بیدلؔ کا اثر''،حبیبہ سعید،ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان،۱۹۶۶ء،ص ۱۱۶۔
۳۰۶)''فکرِ غالبؔ کا تقابلی جائزہ''،این۔ایم شارق،نگراں کا نام ندارد،سنہ ندارد،ص ۱۳۱۔
۳۰۷)''یادگارِ غالبؔ کی شخصیات''،محمد زاہد خان،ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان،۱۹۶۵ء،ص ۱۶۱۔
۳۰۸)''فن تضمین نگاری وتضامین بر کلامِ غالبؔ''،شوکت حسین،ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان،۱۹۷۲ء،ص ۳۸۴۔
۳۰۹)''جے پور میں سلسلۂ تلامذۂ غالبؔ''،(تذکرہ) مسیح الدین عثمانی،پروفیسر فہمیدہ شیخ،۱۹۹۱ء،ص ۱۵۹(۶۸)
۳۱۰)''غالبؔ کا علمی ماحول اُن کے خطوط کے آئینے میں''، رضاء اللہ خان، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان،
۱۹۶۸ء،ص ۱۳۹۔

۴۔ ''مطالعۂ خصوصی''

۳۱۱)''آبلہ پا''،(رضیہ فصیح احمد) شاہ بیگم،گمشدہ۔
۳۱۲)''ادارۂ یادگارِ غالبؔ کی ادبی خدمات''،حنا،ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال،۲۰۰۳ء،ص ۳۵۰۔

۳۱۳) ''اُداس نسلیں (ناول) ایک تنقیدی جائزہ''، نور احمد خان، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۸ء،
ص ۱۴۲ گمشدہ۔

۳۱۴) ''اُردو ادب میں اسلامی قدریں''، سیّد محمد انور حسین نقوی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۷۲ء، ص ۲۲۳۔

۳۱۵) ''اُردو ادب میں تحریکِ اصلاح''، آنسہ حسنہ ادریس، پروفیسر ظفر عابدی، ۱۹۶۷ء، ص ۴۲۔

۳۱۶) ''اُردو ڈکشنری بورڈ، ایک مطالعہ''، عابدہ ہما، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۲۰۰۳ء، ص ۳۳۵۔

۳۱۷) ''اُردو زبان اور ملکی سیاسیات''، عالیہ رحمانی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۳ء، ص ۱۴۴ گمشدہ۔

۳۱۸) ''اُردو شاعری میں شعائرِ اسلام پر پھبتیاں اور اُن کا پس منظر''، عبدالباری، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان،
۱۹۶۵ء، ص ۲۰۰۔

۳۱۹) ''اُردو شاعری پر تصوف کے اثرات''، عبدالرزاق سومرو، گمشدہ۔

۳۲۰) ''اُردو شاعری میں ظرافت کی مثالیں''، مقالہ نگار کا نام ندارد، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۵۸ء، ص ۱۲۴۔

۳۲۱) ''اُردو شعرا کی تذکرہ نگاری''، (پاکستانی دور) یاسمین بانو، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۱۹۹۳ء، ص ۴۲۵۔

۳۲۲) ''اُردو کی انقلابی شاعری''، سردار احمد خان، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۱ء، ص ۱۱۲ گمشدہ۔

۳۲۳) ''اُردو کی جلسیہ شاعری''، قیوم بیگ، گمشدہ۔

۳۲۴) ''اُردو کی رزمیہ شاعری''، بلقیس رفعت قریشی، گمشدہ۔

۳۲۵) ''اُردو لغات کا ارتقاء''، شیخ محمد عثمان، ۱۹۶۵ء، گمشدہ۔

۳۲۶) ''اُردو کی طنزیہ شاعری''، غلام رسول، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۵ء، ص ۱۷۴۔

۳۲۷) ''اُردو نثر میں تصوف کے اثرات''، رفعت سلطانہ، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۵ء، ص ۳۵۴۔

۳۲۸) ''اسلام اور شاعری ایک جائزہ''، دلاور علی خان، عتیق احمد جیلانی، ۲۰۰۳ء، ص ۹۳۔

۳۲۹) ''الفاروق میں مصنف کا مذاق و ماحول اور اس کتاب پر سیر حاصل تبصرہ''، آنسہ جہانگیر فاطمہ،
ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۲۰۲۔

۳۳۰) ''انجمن ترقی اُردو کی خدمات''، بانو جمیل، گمشدہ۔

۳۳۱) ''باغ و بہار کا تحقیقی جائزہ''، سیّد احمد، گمشدہ۔

۳۳۲) ''بیسویں صدی کے قرآنی اُردو تراجم''، منظور الحق، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۲۶۴۔

۳۳۳) ''پاکستان میں جدید اُردو ادب کا ثقافتی پس منظر''، خلیل احمد کلیم، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۱ء، ص ۱۶۴۔

۳۳۴) ''پاکستان میں جدید اُردو غزل''، عزیزہ نصرت، گمشدہ۔

۳۳۵)''پاکستانی جامعات کے مقالات''،صوفیہ بی بی، پروفیسر رابعہ اقبال،۱۹۹۶ء،ص ۱۶۶۔
۳۳۶)''تحریکاتِ احیائے دین اور اُردو ادب پر اُن کے اثرات''، نجم الدین صدیقی (نجم الاسلام)
ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان،۱۹۶۰ء،ص ۱۶۹(۶۹)۔
۳۳۷)''تدریجی لغت'' (جماعت اوّل تا دہم کی ذہنی سطح کے مطابق)، صادقہ شاہین لودھی، عتیق احمد
جیلانی،۲۰۰۳ء،ص ۱۲۴۔
۳۳۸)''تلاشِ بہاراں ایک تنقیدی جائزہ''، سیّد اقبال حسین زیدی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، سنہ ندارد، ص ۱۱۱۔
۳۳۹)''تقسیمِ ہند کا اثر اُردو ادب پر''، شبیب نصرت شیروانی،۱۹۶۵ء، گمشدہ۔
۳۴۰)''جامعۂ سندھ میں اقبال شناسی''، ظفر محمد قریشی، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال،۲۰۰۱ء،ص ۳۴۶۔
۳۴۱)''جدید جنگ سے متعلق اُردو مضامین''، (مرتبہ) شاکر جعفری، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان،۱۹۶۶ء،ص ۲۳۹۔
۳۴۲)''حدائقِ بخشش ایک تحقیقی اور تقابلی جائزہ''، شفیق احمد شیخ، ڈاکٹر سعدیہ نسیم،۱۹۸۷ء،ص ۱۰۳۔
۳۴۳)''حیدر آباد کے اُردو کتبات''، محمد حسن عطا، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان،۱۹۶۸ء،ص ۲۲۹۔
۳۴۴)''خدا کی بستی ایک تنقیدی جائزہ''، سیّد مطاہر حسین، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، سنہ ندارد، ص ۱۶۱۔
۳۴۵)''دہلی کالج کی ادبی خدمات''، شبیر احمد، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان،۱۹۶۵ء، گمشدہ۔
۳۴۶)''دہلی کی معاشرت، قصائدِ سودا کے آئینے میں''، سیّد عارف، گمشدہ۔
۳۴۷)''سترہ روزہ جنگ اور اُردو شاعری''، حامد حسن، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان،۱۹۶۶ء،ص ۱۷۴۔
۳۴۸)''سرسیّد احمد خان کے رفقا پر مغربی اثرات''، رضیہ جعفری، گمشدہ۔
۳۴۹)''سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ کی تاریخ، انتظام اور خدمات کا جائزہ''، رخسانہ کنول، مرزا سلیم بیگ،
۱۹۹۷ء،ص ۸۰۔
۳۵۰)''سندھ میں صوفیانہ شاعری''، مظفر حسین، گمشدہ۔
۳۵۱)''سندھ یونیورسٹی میں نعت شناسی''، نصرت علیم الدین، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال،۲۰۰۱ء،ص ۳۸۰۔
۳۵۲)''سندھی شعرا میں اُردو شاعری کا رجحان''، سکندر علی، پروفیسر فہمیدہ شیخ،۱۹۹۷ء،ص ۱۲۱۔
۳۵۳)''شامِ اودھ کا تنقیدی مطالعہ''، دُرِ شہوار، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان،۱۹۶۶ء،ص ۱۱۱۔
۳۵۴)''شاہنامۂ اسلام کا تنقیدی جائزہ''، امینہ خاتون، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان،۱۹۶۸ء،ص ۱۲۳۔
۳۵۵)''فسانۂ آزاد کا معاشرتی پس منظر''، سیّد میاں منیر احمد شاہ، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، سنہ ندارد، ص ۷۲۔
۳۵۶)''فسانۂ آزاد میں لکھنوی معاشرہ''، محسن علی،۱۹۶۵ء، گمشدہ۔

۳۵۷)''فسانۂ عجائب کا تحقیقی مطالعہ''، ریحانہ اصغر حسین، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۲۱۲۔
۳۵۸)''فسانۂ مبتلا کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ''، مسرت نقوی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۶۶۔
۳۵۹)''فنِ تحقیق کا ارتقاء''، فردوس فاطمہ، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۴ء، ص ۴۰۰ گمشدہ۔
۳۶۰)''قطب شاہی دور کی معاشرتی زندگی دکنی شاعری کے آئینے میں''، احمد علی، ڈاکٹر سعدیہ تسیم، ۱۹۹۵ء، ص ۷۵۔
۳۶۱)''لکھنوی ادب میں بیگماتی ماحول''، سید جہانگیر شاہ، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۵۔
۳۶۲)''موجودہ جنگ ۱۹۶۵ء، سے متعلق اُردو نظمیں، حامد حسن، گمشدہ (۷۰)۔
۳۶۳)''مقدمۂ شعروشاعری پر عربی ادب کا اثر''، عبدالرزاق، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۳ء، ص ۱۷۳ (۷۱)۔
۳۶۴)''ہم نفسانِ رفتہ ایک جائزہ''، مبارک علی قریشی، ڈاکٹر نجم الاسلام، ۱۹۸۷ء، ص ۱۱۰ (۷۲)۔

۵۔ ''بچوں کا ادب''

۳۶۵)''اُردو میں بچوں کا ادب''، محمد محمود الرحمٰن سیّد، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۱ء، ص ۱۸۲۔ (۷۳)۔
۳۶۶)''بچوں کے لیے کی گئی شاعری''، محمد علی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۸۸۔
۳۶۷)''بچوں کے لیے حکیم محمد سعید کے سفرنامے''، (۲۷ سفرناموں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ) ارشاد محمد، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۱۹۹۸ء، ص ۱۰۱۔ (۷۴)۔

۶۔ ''اصناف''

۳۶۸)''اُردو چار بیت اور اُس کا فن''، شیخ خلیل الرحمٰن (رحمانی)، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۷۰ء، ص ۱۷۶۔
۳۷۸)''اُردو ڈرامے کا ارتقاء''، طاہر حسین جعفری''، ۱۹۶۵ء، گمشدہ۔
۳۷۹)''اُردو شعرا کی پہیلیاں''، عطاء الرحمٰن عثمانی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۰۷۔
۳۸۰)''اُردو شعرا کے قطعات تاریخ''، سلمیٰ احمد، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۷۱ء، ص ۳۳۰۔
۳۸۱)''اُردو شاعری میں منقبت''، وقار احمد خان، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۳ء، ص ۱۰۳۔
۳۸۲)''اُردو غزل میں فنی خصوصیات''، سیّدہ انیس فاطمہ، نگراں کا نام ندارد، ۱۹۶۶ء، ص ۳۸۔
۳۷۷)''اُردو کے نظریاتی ناول''، پیر محمد، عتیق احمد جیلانی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۵۸۔
۳۷۸)''اُردو کے سفرنامے''، سیّد محمود علی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۴ء، ص ۲۴۹۔
۳۷۹)''اُردو مثنوی کا فن، ابتدا اور مطالعاتِ مثنوی، اُردو رسائل کی روشنی میں، روزینہ حنیف شیخ، عتیق احمد جیلانی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۱۵۔

۳۸۰) ''اُردو مرثیے کے مطالعات''، حسین فاطمہ، پروفیسر فہمیدہ شیخ، ۱۹۹۵ء، ص ۲۶۸۔
۳۸۱) ''اُردو مرثیے میں واقعات کا ارتقا''، ظہیر الحسن رضوی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۰ء، ص ۱۵۳ گمشدہ۔
۳۸۲) ''اُردو مسدس کا ارتقا''، غوثیہ زرین لکھنوی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۱ء، ص ۲۰۷ گمشدہ۔
۳۸۳) ''اُردو میں خاکہ نگاری''، مشتاق احمد خان زادہ، ۱۹۶۴ء، گمشدہ۔
۳۸۴) ''اُردو میں سوانح نگاری''، سیّد مظہر الحق، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۱ء، گمشدہ۔
۳۸۵) ''اُردو میں مقالہ نگاری''، عبدالمجید، گمشدہ۔
۳۸۶) ''اُردو میں مکتوب نگاری''، جمیل احمد، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۹۷۔
۳۸۷) ''اُردو ناول کا منتخب موضوعاتی جائزہ''، فرید الدین، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۱۹۹۲ء، ص ۱۹۱۔
۳۸۸) ''اُردو نظم کا ارتقا (۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۱ء تک) فضل حق، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۴۲۶۔
۳۸۹) ''اُردو نعت کے مطالعات''، نیاز احمد، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۱۹۹۶ء، ص ۳۰۵۔
۳۹۰) ''اُردو کی نعتیہ شاعری پر قرآن و حدیث کے اثرات''، محمد عبدالمقیت، ۱۹۶۹ء، گمشدہ۔
۳۹۱) ''بکٹ کہانی عرف بارہ ماسہ، از افضل جھنجھالوی''، شاہدہ صدیقی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۰۷۔
۳۹۲) ''پاکستان کے ریڈیائی ڈرامے''، رضیہ محمود، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۷۱ء، ص ۲۱۰۔
۳۹۳) ''پاکستان میں اُردو ناول''، عبدالحق خان (حسرت کاسگنجوی) ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۵ء، ص ۳۴۶۔
۳۹۴) ''پاکستان میں افسانہ''، احمد شمیم خان، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۰۲۔
۳۹۵) ''پاکستان میں جدید اُردو غزل''، عزیزہ ندرت صدیقی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۷۱ء، ص ۱۲۹۔
۳۹۶) ''جدید نظم ہیئت اور مواد''، اشرف اللہ یوسف زئی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۷۳۔
۳۹۷) ''ریڈیو پاکستان حیدرآباد اور اُردو ریڈیائی ڈرامے''، رفیع الدین صدیقی، ڈاکٹر جاوید اقبال، ۱۹۹۶ء، ص ۱۶۶۔
۳۹۸) ''شمالی ہند میں مثنوی کا ارتقا''، قمر عثمانی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، سنہ ندارد، ص ۱۰۳۔
۳۹۹) ''لکھنؤ اسکول کی غزل کا معاشرتی پس منظر''، حمید اللہ صدیقی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۹۳ء، ص ۳۵۷۔
۴۰۰) ''ہندوستانی انقلاب میں اُردو نظم کا ارتقا''، ایم ایچ سبزواری، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۵۹ء، ص ۱۵۳۔

۷۔ ترتیب و تدوین

۴۰۱) ''ایجادِ رنگین، از سعادت یار خان رنگین، اُردو کی غیر مطبوعہ مثنوی ترتیب و تحشیہ مع مقدمہ''، تسنیم نقوی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۸۰۔

۴۰۲)''انتخاب کلام رعنا اکبر آبادی''، فرزانہ خان، گمشدہ۔

۴۰۳)''دیوانِ ابجدی (مرتبہ)''، اسرار احمد خان، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۶۹۔

۴۰۴)''دیوانِ بشیر (ترتیب وتدوین)''، شمیم فاطمہ قادری، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۸۸۔

۴۰۵)''دیوانِ خواجہ احسن اللہ خان بیان دہلوی''، مرتبہ ضیاء الدین احمد، ۱۹۶۴ء، گمشدہ۔

۴۰۶)''دیوانِ بیکس''، راحت مسعود، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، گمشدہ۔

۴۰۷)''دیوانِ خلیل ہانسوی، مرتبہ، سیّد رفیق احمد، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، سنہ ندارد، ص ۱۴۲۔

۴۰۸)''دیوانِ عاقل دہلوی''، حبیبہ حسن، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، گمشدہ (۷۵)۔

۴۰۹)''دیوانِ سجاد اکبر آبادی، مرتبہ، مع مقدمہ''، محمد انیس الدین انصاری، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۰ء، ص ۲۸۰ (۷۶)۔

۴۱۰)''دیوانِ صبا غنچۂ آرزو، مرتبہ، صابرہ قاضی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۴۷ء، ص ۲۶۷۔

۴۱۱)''دیوانِ شاہ قدرت اللہ، مرتبہ، شمس الحق قریشی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۴۲۴۔

۴۱۲)''دیوانِ گلزارِ خلیل''، فرحانہ جبیں، گمشدہ۔

۴۱۳)''دیوانِ میر حسن''، بلقیس بشیر، گمشدہ۔

۴۱۴)''دیوانِ نظام''، طلعت پروین، گمشدہ۔

۴۱۵)''رشحاتِ صدیقی (ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے تنقیدی مضامین)''، حکیم الدین، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۲ء، ص ۲۶۸۔

۴۱۶)''سندھ کی لوک کہانیاں''، نظر کامرانی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۵۵۔

۴۱۷)''شہادت نامہ سیّد خوند میر (غیر مطبوعہ مثنوی)''، نبیلہ شہناز، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۴۳۔

۴۱۸)''صدقِ جاوید کی سچی باتیں''، تصدق حسین، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۸۲۳۔

۴۱۹)''ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کے تحقیقی مضامین''، سیّد آلِ احمد جعفری، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۷۲ء، ص ۴۲۰۔

۴۲۰)''عبدالسلام ندوی کے ادبی مضامین''، عبداللہ شیخ، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۳۹۸۔

۴۲۱)''ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کی غیر مدوّن تحریریں (مع حواشی)''، پرویز احمد شیخ (سلمان احمد)، پروفیسر فہمیدہ شیخ، ۱۹۹۸ء، ص ۷۵۵۔

۴۲۲)''کلیاتِ حکیم آغا خان عیش دہلوی''، شیخ محمد جبریل صدیقی، ۱۹۶۴ء، گمشدہ۔

۴۲۳) ''کلیاتِ قاضی امین الدین آثر عثمانی''، محمد نعیم شیخ، پروفیسر فہمیدہ شیخ، ۱۹۹۳ء، ص ۳۰۲۔
۴۲۴) ''کلیاتِ ندرت میرٹھی''، مشکور احمد انجم، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، سنہ ندارد، ص ۳۵۰۔
۴۲۵) ''لمعاتِ نشتر دہلوی''، معراج الدین عظیم، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، سنہ ندارد، ص ۱۰۰۔
۴۲۶) ''مثنوی لطف، از مرزا علی لطف''، سیّد اشتیاق علی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، سنہ ندارد، ۴۷۔
۴۲۷) ''مثنوی لیلیٰ مجنوں'' از تجلی دہلوی، محبوب عالم خان، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ۱۹۶۴ء، گمشدہ۔
۴۲۸) ''مثنوی میر ضمیر''، طاہر صدیقی ذکائی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۴ء، ص ۷۷۔
۴۲۹) ''مثنوی ندرت عشق از مولوی محمد باقر آگاہ دہلوی''، ناظم حسین، نگراں کا نام ندارد، ۱۹۷۰ء، ص ۴۱۰۔
۴۳۰) ''مرزا ماتل دہلوی کے حالاتِ زندگی اور اُن کی شاعری''، فصیحہ خورشید، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۹ء، ص ۲۶۷۔
۴۳۱) ''مکاشفاۃ الاسرار''، مصنفہ سیّد علی غمگین دہلوی، رقیہ بیگم، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۷۸ء، ص ۲۸۵۔
۴۳۲) ''میاں بشیر احمد کے ادبی مضامین''، امین فاروق، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، سنہ ندارد، ص ۲۸۶۔
۴۳۳) ''نواب جہاں بیگم شیریں کے دیوان کی ترتیب وتدوین''، ناہید صدیقی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۷۲ء، ص ۲۸۶۔
۴۳۴) ''نیاز فتح پوری کے ادبی مضامین''، محمد حنیف خان لودھی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۳۷۴۔

۸۔ ترجمہ وتعلیقات:

۴۳۵) ''Islam is the cross road'' (اسلام دوراہے پر) نجم الدین مغل، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۵۷ء، ص ۸۵۔
۴۳۶) ''اسلامیات اور الٰہیات کا ارتقاء، مترجم: از ڈنکن جی میکڈونلڈ''، محمد احمد اللہ خان، ڈاکٹر محمد مسعود، ۱۹۵۷ء، ص ۲۷۴ (۷۷)۔
۴۳۷) ''اسلامی فلسفیانہ افکار اور اُن کی تاریخی و مذہبی حیثیت''، (از ڈاکٹر اولیسری ڈین آ دان) افتخار حسین جاوید، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۵۸ء، ص ۱۹۵۔
۴۳۸) ''Principal of Litracy Critics, By: Prof. Lascelles Abererobic ترجمہ اُردو نقد ادب''، محمود الحسن چوہدری، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۵۷ء، ص ۱۵۳۔(۷۸)
۴۳۹) ''Creatic technique in fictions'' افسانے میں تخلیقی اُسلوب، مترجم: فرانس ویون، مس طاہرہ عثمانی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۰ء، ص ۳۱۳۔

۴۴۰)''تاریخِ سندھ، تاریخِ معصومی، مترجم: از میر معصوم بکھری ترجمہ وحواشی وتعلیقات''، عزیز احمد فاروقی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۵۷ء، ص ۳۴۵۔

۴۴۱)''تحفہ تاقی کوثر''، سیدہ رئیس فاطمہ، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۷۰ء، گمشدہ (۷۹)۔

۴۴۲)''تحفۃ الظاہرین از شیخ محمد اعظم بن محمد شفیع''، مترجم: ثریا جبیں، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۰ء، ص ۱۵۱۔

۴۴۳)''تحفۂ مجددیہ مع متن وترجمہ''، شاہ ابوالحسن، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۱ء، ص ۸۹۔

۴۴۴)''تذکرہ ریختہ گویاں از سید فتح علی حسین گردیزی''، ترجمہ وحواشی، ماجدہ خاتون، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۷۱ء، ص ۲۴۸۔

۴۴۵)''اُردو تذکرۂ سرور''، ریحانہ زہرا، ڈاکٹر نجم الاسلام، ۱۹۸۲ء، ص ۱۰۹۔

۴۴۶)''تذکرۂ گلِ عجائب (ترجمہ وتدوین)''، بشیر احمد نسیم، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان سنہ، ندارد، ص ۱۶۰۔

۴۴۷)''تمدنِ عرب، از پروفیسر جوزف ہیل''، مترجم: عبدالکافی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۰ء، ص ۱۵۱۔

۴۴۸)''تمدنِ ہند پر اسلامی اثرات اور ڈاکٹر تاراچند (ترجمہ وتعلیقات)''، محمد مسعود احمد، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۵۸ص ۳۴۴۔

۴۴۹)''جاپان میں اسلام، از بیرسٹر عبدالعزیز (خطبات کا ترجمہ)'' اقبال بیگم، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۵۹ء، ص ۲۱۹۔

۴۵۰)''دینِ اسلام از پروفیسر ایچ اے آر گبز''، مترجم: سیّد حافظ غلام معین الدین احمد، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۵۹ء، ص ۳۴۷ (۸۰)

۴۵۱)''Seasame And Lilies''، مترجم: شمیم احتشام عالم، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۵۸ء، ص ۱۹۳۔

۴۵۲)''شاہ عبداللطیف بھٹائی از ایچ اے سورلے''، مترجم: شاہد علی زیدی، پروفیسر مسعود احمد خان، ۱۹۵۸ء، ص ۳۲۹۔

۴۵۳)''رسالۂ اوّل اعجازِ خسروی''، مترجم: سیّد واحد حسین تقوی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۰ء، ص ۲۰۲ گمشدہ۔

۴۵۴)''عمدہ منتخب فارسی یعنی تذکرۂ سرور''، اُردو مترجم: آنسہ ریحانہ زہرا، ڈاکٹر نجم الاسلام، ۱۹۸۲ء، ص ۱۰۸۔

۴۵۵)''فکر وفنِ اقبال از سیّد عبدالواحد''، مترجم: ضیاء احمد شریفی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۱ء، ص ۲۲۰۔

۴۵۶)''لُبِ تاریخ سندھ''، مترجم: سیّد آفتاب احمد جعفری، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۰ء، ص ۱۴۷۔

۴۵۷)''محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم معلمِ اعظم''،از رابرٹ ایل گولک جا، مترجم: آصفہ بیگم نقوی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۰ء، ص ۱۸۳۔

۴۵۸)''مجالسِ رنگین از سعادت یار خان رنگین (ترجمہ وحواشی)''، شاہد اصلاح الدین، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۷۱ء، ص ۱۴۶۔

۴۵۹)''مخزنِ شعرا'' تذکرۂ شعرائے اُردو، گجرات'' از قاضی نور الدین (مولوی عبدالحق مرحوم کا اُردو ترجمہ) حسینی خان رضوی فائق، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۷۱ء، ص ۱۸۳۔

۴۶۰)''مخزنِ نکات (ترجمہ) مصحفی (مع حواشی وتعلیقات) فرزانہ نامدار، گمشدہ۔

۴۶۱)''میئر آف کنٹر برج (ترجمہ) مصنف تھامس یارڈی''، صالحہ خاتون، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۵۹ء، ص ۵۷۷۔

۴۶۲)''نقدِ ادب کے اُصول''، از ڈاکٹر آئی اے رچرڈ، مترجم، محمد الیاس خان، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۰ء، ص ۳۳۸۔

۹۔''حواشی وتعلیقات''

۴۶۳)''اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کے مآخذات''، (طرزِ تعارف کا جائزہ) محمد سجاد حیدر، مرزا سلیم بیگ، ۱۹۹۱ء، ص ۶۱۔

۴۶۴)''النبی الخاتم کے تعلیقات وحواشی''، از مناظر حسن گیلانی، شمیم نکہت، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۳۰۸۔

۴۶۵)''باغ وبہار کے حواشی وتعلیقات''، زبیدہ خاتون، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۲۰۔

۴۶۶)''حالی کا ذہنی ارتقاء حواشی وتعلیقات''، شاہینہ پروین زیدی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۷۸ء، ص ۶۰۔

۴۶۷)''حیاتِ سعدی پر حواشی وتعلیقات''، سیّد انصار حسین نقوی، ۱۹۶۹ء، گمشدہ۔

۴۶۸)''خطباتِ مدراس تعلیقات وحواشی''، کشور سلطانہ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۲۸۰۔

۴۶۹)''گلزارِ نسیم کے حواشی وتعلیقات''، عابدہ نسیم، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۰۲۔

۴۷۰)''مثنوی تصنیفِ رنگین ترتیب وتحشیہ ومقدمہ''، ضمیر احمد خان، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۲۹۔

۴۷۱)''مثنوی چراغِ کعبہ کے حواشی وتعلیقات''، غضنفر حسین، ۱۹۶۹ء، گمشدہ۔

۴۷۲)''مثنوی سحر البیان کے حواشی وتعلیقات''، خورشید جعفری، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۱۰۔

۴۷۳)''مثنوی صبحِ تجلی کے حواشی وتعلیقات''، غلام حسین، ۱۹۶۹ء، گمشدہ۔

۴۷۴)''مقالاتِ حالی کے حواشی وتعلیقات''، اقلیم النساء، گمشدہ۔
۴۷۵)''نقوشِ سلیمانی پرحواشی وتعلیقات''، ناظم حسین، گمشدہ۔
۴۷۶)''نمونہ منثورات کا مطالعہ''، محمد سعید، مرزا سلیم بیگ، ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۲۔

۱۰۔تذکرہ وتاریخ

۴۷۷)''اُردو کے اہم لغت نگار''، شجاعت حسین، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۱۹۹۲ء، ص ۸۷۔
۴۷۸)''اُردو کی جدید افسانہ نگار خواتین''، ثریا خان، ۱۹۶۵ء، گمشدہ۔
۴۷۹)''اُردو کے عہدآفرین شعرا حالی تک''، شکیلہ سیّد، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۵ء، ص ۲۵۸۔
۴۸۰)''اُردو کے منتخب نعت گوشعرا (پاکستانی دور)'' شہناز فاطمہ، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۱۹۹۳ء، ص ۱۷۶۔
۴۸۱)''بلگرام کے اُردو شعرا (تذکرہ) مرتبہ بلقیس گرامی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۴۔
۴۸۲)''پاکستان کی افسانہ نگار خواتین''، قدسیہ زیدی، نگراں کا نام ندارد، سنہ ندارد، ص ۲۳۷۔
۴۸۳)''پاکستان کی منتخب افسانہ نگار خواتین''، دردانہ شوکت (دردانہ جاوید) پروفیسر رابعہ اقبال، ۱۹۹۶ء، ص ۱۸۵(۸۱)۔
۴۸۴)''پاکستانی یونی ورسٹیوں کے اساتذہ کی اُردو خدمات''، سلطانہ جہاں، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۵۱۴۔
۴۸۵)''تذکرۂ شعرائے اُردو حیدرآباد''، سرور احمد زئی، ڈاکٹر سعدیہ نسیم، ۱۹۹۵ء، ص ۲۷۸۔
۸۸۶)''تقسیمِ برصغیر کے بعد سابق صوبۂ سندھ میں نعت گوئی''، اسرار حسین نقوی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۲۵۔
۴۸۷)''حیدرآباد سندھ کے نعت گوشعرا''، سیّد محمد توصیف، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۱۔
۴۸۸)''حیدرآباد کی ادبی تنظیمیں اور فروغِ ادب میں اُن کا کردار''، وثیق الرحمٰن صابر، حمایت علی شاعر، ۱۹۸۳ء، ص ۱۱۷(۸۲)۔
۴۸۹)''حیدرآباد کے افسانہ نگار اور فروغِ ادب میں اُن کا کردار''، عبدالرؤف خان، ڈاکٹر سعدیہ نسیم، ۱۹۹۶ء، ص ۱۶۹۔
۴۹۰)''حیدرآباد کے چند مزاح گوشعرا''، محمد افضال، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۲۰۰۱ء، ص ۱۶۷۔
۴۹۱)''ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کے نامور شاگردوں کی ادبی خدمات کا جائزہ''، نازنین سلیم، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۱۹۹۸ء، ص ۲۸۹(۸۳)۔

۴۹۲) ''سندھ کے فارسی شعرا''، مترجم محمد رفیق، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۱ء، ص ۵۵۱ گمشدہ۔

۴۹۳) ''سندھ کے منتخب اُردو افسانہ نگار''، شمیم الدین حجازی، پروفیسر فہمیدہ شیخ، ۱۹۹۳ء، ص ۱۳۸۔

۴۹۴) ''سندھ کے موجودہ اُردو شعرا''، سیّد مشتاق علی جعفری، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۵۸ء، ص ۱۴۷ (۸۴)۔

۴۹۵) ''سکھر میں اُردو ادب کا ارتقا''، امین اختر جامی، پروفیسر سردار احمد خان، سنہ ندارد، ص ۴۷۔

۴۹۶) ''سندھی کے جدید اُردو مصنفین (تذکرہ) عبدالرشید خان (رشید تبسم)، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۹ء، ص ۲۰۲۔

۴۹۷) ''سندھ میں اُردو، کلہوڑوں اور تالپوروں تک''، محمد ابراہیم بھٹو، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۵ء، ص ۱۰۵۔

۴۹۸) ''شاعرات پاکستان''، سیّد عابد حسین، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۳۴۱۔

۴۹۹) ''شعبۂ اُردو کی تاریخ''، نعیمہ اختر سومرو، ڈاکٹر سعدیہ نسیم، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۲۔

۵۰۰) ''ضلع سانگھڑ کے اُردو شعرا (تذکرہ)''، ملک غلام مصطفےٰ تبسم، فہمیدہ شیخ، ۱۹۹۶ء، ص ۲۰۳۔

۵۰۱) ''علمائے اسلام کی اُردو شاعری''، قطب الدین رائے پوری، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۰۶۔

۵۰۲) ''علمائے دیوبند کا ادبی ذوق''، ارشاد علی خان، نگراں کا نام ندارد، سنہ ندارد، ص ۲۳۳۔

۵۰۳) ''مارواڑ میں اُردو''، عبدالسلام صدیقی، نگراں کا نام ندارد، ۱۹۶۷ء، ص ۴۷۔

۵۰۴) ''مشرقی پاکستان میں زبان و ادب کی تحریک (تقسیم ہند سے تقسیم پاکستان تک) شفیق احمد، پروفیسر رابعہ اقبال، ۱۹۸۱ء، ص ۲۲۲ (۸۵)۔

۵۰۵) ''ملتان کے منتخب اُردو شعراء''، (تذکرہ) عبدالغفور، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۱۹۹۶ء، ص ۱۳۴۔

۵۰۶) ''میرپور خاص کے ادبا و شعرا (تذکرہ)، عبدالجبار، مرزا سلیم بیگ، ۱۹۹۷ء، ص ۱۵۲۔

۵۰۷) ''میرپور خاص کی ادبی تنظیمیں''، کرن سنگھ، ڈاکٹر نجم الاسلام، ۱۹۸۴ء، گمشدہ (۸۶)

۱۱۔ ''فصاحت و بلاغت''

۵۰۸) ''آتش کے محاورات، مصطلحات، تلمیحات''، دولت بانو، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۷۶ء، ۲۲۱۔

۵۰۹) ''اُردو زبان میں فارسی محاورات''، صالحہ پروین، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۱۔

۵۱۰) ''اُردو میں شرعی مصطلحات''، عبدالکریم خان، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص: ۱۱۵۔

۵۱۱) ''اُردو میں عورتوں کے محاورات اصطلاحات''، سیّد انور علی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۰۲۔

۵۱۲) ''تلمیحاتِ امیر مینائی''، انیس نظر عسکری، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۲۰۴۔

۵۱۳) ''تلمیحاتِ انیس''، محمد اعظم، پروفیسر سردار احمد، ۱۹۶۷ء، ص ۱۴۷۔

۵۱۴) ''تلمیحاتِ بانگِ درا''، خالد انصاری، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۳۳۷۔

۵۱۵) ''ذوق کے محاورات''، ریحانہ عزیز، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۴۶۔
۵۱۶) ''ضربِ کلیم کی تلمیحات''، کنور محمد شریف، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۶ء، ص ۵۴۔
۵۱۷) ''کلامِ شبلی کی تشبیہات و استعارات''، اسلم نواز، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۸ء، ص ۱۰۶۔
۵۱۸) ''محاوراتِ انیس''، پروین زیدی سیّد، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۸۸۔
۵۱۹) ''محاورات و تلمیحات''، حسن آرا صدیقی، ۱۹۶۹ء، گمشدہ۔
۵۲۰) ''نذیر احمد کے ترجمۂ قرآن میں اُردو محاورات''، شہناز سلیم، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۷۰ء، ص ۱۹۰۔
۵۲۱) ''شمس العلماء مولانا نذیر احمد کی تصانیف میں قرآنی تلمیحات''، محمد عبدالاحد، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، سنہ ندارد، ص ۲۰۴۔
۵۲۲) ''نظیر اکبرآبادی کے محاورات''، شمیم خان، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، سنہ ندارد، ص ۱۴۵۔

۱۲۔ ''لسانیات رصرف ونحو''

۵۲۳) ''اُردو اور پنجابی کے لسانی روابط''، عبدالغفور ساجد، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۶۸۔
۵۲۴) ''اُردو اور راجستھانی بولیاں''، عزیز احمد انصاری، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۵ء، ص ۱۶۵۔
۵۲۵) ''اُردو اور سرائیکی کے لسانی روابط''، شاہدہ اشرف گورگانی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۷۵۔
۵۲۶) ''اُردو زبان میں صرف ونحو کا ارتقا''، عبدالرشید، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۶۳ء، ص ۱۴۲۔
۵۲۷) ''اُردو ہندی کے لسانی روابط''، نعیم اللہ خان، گمشدہ۔
۵۲۸) ''سندھ میں اُردو زبان کا ارتقا''، محمد الیاس، گمشدہ۔

۱۳۔ ''اُردو تنقید''

۵۲۹) ''اُردو تنقید پر مغرب کے اثرات''، حبیب الرحمٰن حبیب، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۷۲ء، ص ۳۰۴۔
۵۳۰) ''اُردو تنقید کے قدیم رجحانات تذکروں میں''، آنسہ سرتاج محمود، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۷۴ء، ص ۱۷۔
۵۳۱) ''جدید تنقیدی رجحانات اور اُن کا پس منظر''، اقتدار علی خان، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۷۴ء، ص ۲۴۰۔
۵۳۲) ''فنِ تنقید میں تذکروں کی اہمیت''، اشفاق احمد خان، ۱۹۶۴ء، گمشدہ۔

۱۴۔ ''اَدبی رسائل کے جائزے''

۵۳۳) ''اُردو کے جامعاتی مجلّے''، سلطان عثمان، پروفیسر رابعہ اقبال، ۱۹۹۱ء، ص ۱۵۵۔

۵۳۴) ''خدابخش لائبریری جرنل، علمی و تحقیقی خدمات کا جائزہ''، حماعنبرین، پروفیسر فہمیدہ شیخ، ۱۹۹۱ء، ص ۱۵۳ (۸۷)۔

۵۳۵) ''صریرِ خامہ''، کے خاص شماروں کا جائزہ''، محمد قاسم عباسی، پروفیسر فہمیدہ شیخ، ۲۰۰۲ء، ص ۱۱۹۔

۵۳۶) ''ماہنامہ 'ساقی' کی ادبی خدمات کا جائزہ''، عدنان محمود صدیقی، پروفیسر رابعہ اقبال، ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۰۔

۱۵۔ ''توضیحی اشاریہ''۔

۵۳۷) ''ادبی مطبوعات حیدرآباد سندھ توضیحی اشاریہ''، عطاء اللہ، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۱۹۹۷ء، ص ۲۴۷ (۸۸)

۵۳۸) ''اُردو زبان میں سندھ کے موضوع پر سندھالوجی میں موجود کتابیں، رخسانہ یاسمین، ڈاکٹر نجم الاسلام، ۱۹۸۰ء، ص ۸۵۔

۵۳۹) ''اُردو مخطوطات کی توضیحی فہرست نگاری''، نسرین شیخ، ڈاکٹر نجم الاسلام، ۱۹۹۲ء، ص ۵۶۔

۵۴۰) ''سندھ میں اُردو مخطوطات''، سیّد علی احمد زیدی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، سنہ ندارد، ص ۲۰۲ (۸۹)

۵۴۱) ''سندھ میں اُردو مطبوعات''، (حصہ اول) خان اسلام اختر، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، سنہ ندارد، ص ۱۲۵ (۹۰)

۵۴۲) ''سندھ میں اُردو مطبوعات''، (حصہ دوم) عبدالجمیل، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۹ (۹۱)

۵۴۳) ''سندھ یونیورسٹی میں اُردو مخطوطات''، ضیا نرگس جعفری، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ۱۹۵۹ء، ص ۱۲۵۔

۵۴۴) ''سندھالوجی میں محفوظ پی ایچ ڈی کے مقالوں کی توضیحی فہرست''، شائستہ میمن، سعدیہ نسیم، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۵۔

۱۶۔ ''متفرق اشاریئے''

۵۴۵) ''اُردو کتابوں کے سندھی ترجمے''، شاہد حسین، ۱۹۶۵ء، گمشدہ۔

۵۴۶) ''اشاریہ تراکیبِ اکبر''، فرزانہ ممتاز بیگ، عتیق احمد جیلانی، ۱۹۶۹ء، ص ۱۱۵۔

۵۴۷) اشاریہ سہ ماہی ''العلم''، کراچی، بیبن، عتیق احمد جیلانی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۳۲۔

۵۴۸) ''اشاریہ سہ ماہی 'سیپ' ترنم صغیر احمد، ڈاکٹر سعدیہ نسیم، ۱۹۹۷ء، ص ۲۶۵۔

۵۴۹) ''اشاریہ مضامین رسالہ، اُردو''، محمد نادر مغل، ڈاکٹر سعدیہ نسیم، ۱۹۹۲ء، ص ۹۲۔

۵۵۰) ''دستیاب سوانحی مضامین اور خاکوں کا اشاریہ''، سیّد تنویر فاطمہ، پروفیسر فہمیدہ شیخ، ۱۹۹۸ء، ص ۱۵۶۔

۵۵۱) ''ماہنامہ 'سب رس' (اشاریہ)'' صباحت علی، ڈاکٹر سعدیہ نسیم، ۱۹۹۲ء، ص ۲۵۷۔

۵۵۲) ''ماہنامہ اظہار کا اشاریہ اور اُس کا ادبی جائزہ''، نسیم امیر عالم، فہمیدہ شیخ، ۲۰۰۳ء، ص ۷۳۔

۵۵۳)''ماہ نامہ'فاران' کا منتخب اشاریہ''،صفدر علی خان، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۱۹۹۱ء، ص ۲۲۶(۹۲)

۵۵۴)''ماہ نامہ'قومی زبان' کا اشاریہ''، (۱۹۷۵ء تا ۱۹۹۵ء) عبدالحنان خان، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۱۹۹۶ء، ص ۵۹۷۔

۵۵۵)''ماہ نامہ'قومی زبان' کراچی دستیاب رسائل (اشاریہ ۱۹۴۵ء تا ۱۹۹۶ء) نعیم الدین، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۱۹۹۷ء، ص ۲۱۳۔

۵۵۶)''ماہ نامہ'قومی زبان' کراچی کے خاص نمبروں کا اشاریہ''، احمد رضوی، ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال، ۲۰۰۱ء، ص ۱۷۸۔

۵۵۷)''نقوش، کا خاص نمبر''، یوسف خشک، ڈاکٹر نجم الاسلام، ۱۹۸۹ء، ص ۱۳۹۔

۵۵۸)''نئی قدریں''، حیدرآباد (اشاریہ)''، مختار احمد، عتیق احمد جیلانی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۵۰۔

۵۵۹)''وضاحتی فہرست'نگار پاکستان''، تسنیم جمال، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ۱۹۷۰ء، ص ۴۵۳۔

حواشی

(۱) ''اُردو تحقیق یونیورسٹیوں میں''، الوقار پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۸۔

(۲) ''اخبارِاُردو''، اسلام آباد، شمارہ اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ۰۷۔

(۳) مطبوعہ، انجمن ترقیِ اُردو، پاکستان، ۱۹۷۳ء، صفحات ۲۹۴۔

(۴) غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، شعبۂ اُردو، سندھ یونی ورسٹی، ۱۹۷۳ء۔

(۵) ''اُردو میں اُصولِ تحقیق''، جلد دوم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۳۶۲ تا ۳۶۶۔

(۶) ''اُردو تحقیق یونیورسٹیوں میں''، الوقار پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۸ تا ۱۱۲۔

(۷) سہ ماہی ''نئی عبارت''، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان نمبر، شمارہ ۱۲۔۱۳، جلد ۴، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۸ء، انوارِ ادب، حیدرآباد، صفحات ۲۶۵ تا ۲۷۵۔

(۸) انوارِ ادب، حیدرآباد، ۲۰۰۳ء، صفحات ۴۰ تا ۵۱۔

(۹) شمارہ جون ۲۰۰۲ء، ص ۵۰۔

(۱۰) مطبوعہ آئینۂ ادب، لاہور، ۱۹۸۲ء، صفحات ۵۴۲، یہ شعبۂ اُردو میں لکھا جانے والا پہلا مقالہ ہے اور امیر پر لکھا جانے والا پہلا تحقیقی کام بھی۔ اس کے بعد ۱۹۶۴ء میں آگرہ یونیورسٹی، بھارت میں ڈاکٹر ابو سحر نے اس موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا جو نسیم بک ڈپو، لکھنؤ سے ''مطالعۂ امیر مینائی'' کے عنوان سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔

(۱۱) ۱۹۶۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے سیّد غلام حسین ذوالفقار نے ''اُردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر'' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جو ۱۹۶۷ء میں پنجاب یونیورسٹی پریس سے شائع (صفحات ۵۲۲) ہوا۔ ۱۹۷۱ء میں کراچی

یونیورسٹی سے ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی نے ''اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر'' (۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء) کے عنوان سے مقالہ تحریر کیا جو ۱۹۷۵ء میں ادبی پبلیکیشنز، کراچی نے شائع (صفحات ۲۳۹) کیا۔ ڈاکٹر خان رشید کا یہ مقالہ نہایت اعلیٰ پایے کا ہے۔ افسوس کے شائع نہیں ہوسکا۔ البتہ ''صریر خامہ''، قومی شاعری نمبر، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، ۱۹۶۶ میں اس مقالے کا کچھ حصہ بعنوان ''قومی شاعری کا سیاسی پس منظر''، شائع ہوا، ص ۵۹ تا ۷۱۔

(۱۲) ہمارے علم کے مطابق ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کا یہ مقالہ ''اُردو سندھی کے لسانی روابط'' کے حوالے سے پہلا جامع کام ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۷۱ء میں مرکزی اُردو بورڈ، لاہور، صفحات ۵۱۹، دوسری مرتبہ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد سے صفحات ۵۱۹، اور تیسری مرتبہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد سے ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا، صفحات ۵۱۹۔

(۱۳) مطبوعہ مجلسِ یادگار ہاشمی، کراچی، ۱۹۹۰ء، صفحات ۵۲۷۔ اِس مقالے کا کچھ حصّہ ''صریر خامہ''، شمارہ ۳، ''شبلی کے ساتھ ایک ماہ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ص ۱۸۴ تا ۲۰۲ اس کے علاوہ ''صریرِ خامہ'' تنقیدی ادب نمبر میں بھی ''ایک جزو، ''مولانا شبلی اور ترکی'' کے عنوان سے شائع (ص ۴۴ تا ۴۹) ہوا ہے۔

(۱۴) اس مقالے کے کچھ اجزا شائع ہوئے ہیں۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ ''تین نثری نوادر: نسخۂ مفرح الضحک از شاہ حاتم دہلوی، دیباچہ تفسیر مرادیہ، قصہ احوالِ روہیلہ''، نقوش، لاہور، شمارہ ۱۰۵، ۱۹۶۶ء۔

۲۔ فورٹ ولیم کالج ''نقوش''، لاہور، شمارہ ۱۹۸۶ء۔

۳۔ ''فضلی کی کربل کتھا''، نقوش، لاہور، شمارہ ۱۱۸، ۱۹۷۳ء۔

۴۔ ''گربہ نامہ اور اُس کا مصنف''، صحیفہ لاہور، شمارہ ۴۳، ۱۹۶۸ء۔

۵۔ ''شاہ مراد سنبھلی اور اُن کی اُردو تفسیر''، شعبہ جاتی مجلّہ ''تحقیق''، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، شمارہ ۱۲۔۱۳، ص ۹۹ تا ۱۳۲۔

۶۔ ''شاہ عالم ثانی کی نثر'' شعبہ جاتی مجلّہ ''تحقیق''، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، شمارہ ۷، ۱۹۹۳ء، ص ۲۵۷ تا ۲۸۵۔

۷۔ ''دو موضح قرآن''، شعبہ جاتی مجلّہ ''تحقیق''، سندھ یونیورسٹی، شمارہ خاص نمبر ۱۰۔۱۱، ص ۲۶۹ تا ۲۸۲۔

۸۔ ''حکیم شرف الدین خان دہلوی کا ترجمۂ قرآن''، شعبہ جاتی مجلّہ ''تحقیق''، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی شمارہ ۱۲۔۱۳، ص ۳۶۷ تا ۳۷۳۔

۹۔ ''موضح قرآن کی دو روایتیں'' (لسانی مطالعہ) شعبہ جاتی مجلّہ ''تحقیق''، شعبۂ اُردو سندھ یونیورسٹی، شمارہ ۱۲۔۱۳، ص ۱۳۳ تا ۱۶۶۔

۱۰۔ ''غالب کی لسانی تصریحات''، ''نقوش''، لاہور، شمارہ ۱۱۱۔

(۱۵) یہ مقالہ دو حصّوں میں شائع ہوا ہے۔ پہلا انجمن ترقی اُردو، پاکستان، کراچی نے ۱۹۷۹ء میں۔ صفحات ۲۹۲ جب کہ دوسرا حصہ، مکتبۂ شہریار، کراچی نے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا، صفحات ۴۴۸۔

(۱۶) یہ مقالہ تین حصّوں میں شائع ہوا ہے۔ پہلا ''مولانا ظفر علی خاں بحیثیت شاعر'' کے عنوان سے، انجمن ترقی اُردو، پاکستان نے ۱۹۸۰ء میں۔صفحات ۲۴۷۔ دوسرا حصّہ ''مولانا ظفر علی خاں بحیثیت صحافی'' کے عنوان سے مکتبۂ اُسلوب کراچی نے ۱۹۸۵ء میں۔صفحات ۲۵۶۔ جب کہ تیسرا حصّہ ''مولانا ظفر علی خاں احوال و آثار''، کے نام سے مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور نے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا،صفحات ۲۹۸۔

(۱۷) ''تاریخ ادبِ اُردو''، جلد اوّل کی صورت میں یہ مقالہ ''مجلسِ ترقیِ ادب''، لاہور سے، جولائی ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا، صفحات ۹۴۷۔

(۱۸) یہ مقالہ دو جلدوں میں پیش کیا گیا ہے۔ پہلی جلد (۳۶۶صفحات) میں ''آثار و افکار'' جب کہ دوسری جلد (۴۲۳صفحات) میر سوز کے دیوان پر مشتمل ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین پر بھی بہت محنت کی گئی ہے۔ گویا یہ مقالہ (۷۸۹صفحات) پر مشتمل ہے۔اس مقالے کا کچھ حصّہ شعبہ جاتی مجلّہ ''تحقیق''، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، شمارہ ۱۲۔۱۳، ص ۲۱۱ تا ۳۴۸ میں شائع ہو چکا ہے۔اس کے بعد کتابی صورت میں فضلی سنز کراچی، سے ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا،صفحات ۳۰۶۔

(۱۹) مطبوعہ،مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور،۱۹۹۴ء، صفحات ۶۰۷۔

(۲۰) یہ پاکستان میں غالب پر لکھا جانے والا پہلا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو ۱۹۸۹ء میں ''غالب کا علمی سرمایہ'' کے نام سے یونیورسل بکس، لاہور سے شائع ہوا۔اس کی ضخامت ۶۲۴ صفحات ہے۔

(۲۱) اس مقالے کا کچھ حصّہ ''اُردو کی نعتیہ شاعری پر قرآن و حدیث کے اثرات''، کے عنوان سے ''نقوش'' جنوری ۱۹۸۴ء (ص ۶۴ تا ۹۲) میں شائع ہوا ہے۔

(۲۲) مطبوعہ، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء، صفحات ۳۷۶۔

(۲۳) مطبوعہ قومی ادارہ برائے تحقیق، تاریخ و ثقافت، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، صفحات ۴۳۳۔

(۲۴) اس مقالے کا کچھ حصّہ ''محاورہ۔سماجی عمل'' کے عنوان سے روزنامہ جنگ، کوئٹہ، ۶ جون ۱۹۹۶ء، ص ابقیہ ص ۵ اور ''نذیر احمد، تعلیمِ نسواں و دیگر مصنفین'' کے عنوان سے روزنامہ جنگ، کوئٹہ، ۱۶ نومبر ۱۹۹۶ء، ص ابقیہ ص ۶۔ اس کے علاوہ ''ڈپٹی نذیر احمد کے دیگر مصنفین پر اثرات'' کے عنوان سے ''انشاء'' حیدرآباد جنوری تا مارچ ۱۹۹۵ء، ص ۳۹ تا ۴۳ شائع ہوا۔

(۲۵) اس مقالے کا ایک حصّہ ''اخبارِ اُردو'' اسلام آباد، فروری ۱۹۹۷ء، ص ۱۰ تا ۱۶ میں شائع ہوا۔ اور یہی حصہ ''پاکستانی اُردو کے خدوخال'' مرتبہ: ڈاکٹر عطش دُرّانی، ۱۹۹۸ء میں مقتدرہ قومی زبان نے شائع کیا۔

(۲۶) اس مقالے کے پہلے نگراں ڈاکٹر نجم الاسلام تھے۔اُن کی وفات (۱۲ فروری ۲۰۰۱ء) کے بعد ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کی نگرانی میں یہ کام مکمل کیا گیا۔ اس مقالے کے کچھ اجزا شائع ہوئے ہیں۔ جس کی تفصیل یہ ہے: شعبہ جاتی مجلّہ ''تحقیق'' شعبۂ اُردو سندھ یونیورسٹی، شمارہ ۳، ص ۳۶۹ تا ۴۰۵ اور شمارہ ۴، ص ۳۹۳ تا ۴۴۲۔ شعبہ جاتی مجلّہ ''الماس'' شعبۂ اُردو، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیر پور، شمارہ ۳۔۴، ص ۱۴۷ تا ۱۸۴۔اس کے علاوہ سہ ماہی ''الزبیر'' بھاول پور، شمارہ ۲، ۱۹۹۵ء، ص ۵ تا ۳۳ میں شائع ہوئے۔

(۲۷) مطبوعہ مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، دسمبر ۱۹۸۷ء، صفحات ۴۲۹، یہ مقالہ ''خطباتِ گارسیں دتاسی حواشی وتعلیقات'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

(۲۸) مطبوعہ مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۹ء، صفحات ۳۷۶۔

(۲۹) مطبوعہ حرا فاؤنڈیشن، پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء، صفحات ۵۲۳۔

(۳۰) مطبوعہ ادارۂ یادگارِ احسان، کراچی، ۲۰۰۴ء، صفحات ۳۰۴۔

(۳۱) اس مقالے کے کچھ اجزا شعبہ جاتی مجلّہ ''تحقیق''، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، شمارہ اوّل میں بعنوان '' سے کا مطالعہ''، ص ۱۰۹ تا ۱۴۴۔ اور شمارہ ۲ بعنوان ''ظرنی میں کا مطالعہ''، (ص ۴۲ تا ۷۲) میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک حصہ ''سہ ماہی ''اُردو''، کراچی، شمارہ ۱، جنوری فروری ۱۹۹۱ء (ص ۹۷۔۹۵) میں بعنوان ''اُردو اعداد کا مطالعہ'' شائع ہوا۔

(۳۲) مطبوعہ ریز پبلیکیشنز، راول پنڈی، ۲۰۰۳ء، صفحات ۳۶۲۔

(۳۳) اس مقالے کا ایک جزو کتابی سلسلہ ''راونجات''، کراچی، نعت نمبر شمارہ ۳، مئی ۲۰۰۳ء میں نعت میں ہیئت کے تجربے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ص ۹۹ تا ۱۰۱۔

(۳۴) مطبوعہ مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۴ء، صفحات ۳۴۷۔

(۳۵) اس مقالے کا کچھ حصہ ''ماہ نامہ'' اخبارِ اُردو، اسلام آباد، خصوصی شمارہ مارچ، اپریل ۲۰۰۳ء میں بعنوان ''اُردو سندھی کا مشترک صوتی نظام'' شائع ہوا۔ صفحات نمبر ۳۳ تا ۳۶، بقیہ صفحات نمبر ۱۹۵ تا ۱۹۶۔

(۳۶) اس مقالے کے چند اجزا سہ ماہی ''الزبیر''، بھاولپور، شمارہ ۲، ۱۹۹۵ء، صفحات نمبر ۳۶ تا ۴۰ اور شمارہ ۳، ۱۹۹۸ء میں صفحات نمبر ۱۸ تا ۲۷ بقیہ صفحات نمبر ۶۴ تا ۷۵ شائع ہوئے۔

(۳۷) اس مقالے کا کچھ حصہ ''صریرِ خامہ'' تنقیدی ادب نمبر ۷، ۱۹۶۷ء میں فلسفۂ حسن وعشق'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ صفحات نمبر ۲۲۳ تا ۲۴۵۔

(۳۸) مطبوعہ، مکتبۂ جلیسانِ ادب، حیدرآباد، ۱۹۸۹ء، صفحات ۱۲۰۔ یہ مقالہ ''حیاتِ اختر'' کے نام سے شائع ہوا۔

(۳۹) اس مقالے کی کچھ اقساط ''پہچان'' میرپور خاص میں شائع ہوئی ہیں:

قسط نمبر ۱، شمارہ ۷ (اپریل تا جون ۲۰۰۲ء) بعنوان ''اعجاز جودھپوری شخصیت وفن''، صفحات نمبر ۲۹ تا ۴۷۔

قسط نمبر ۲، شمارہ ۸ (دسمبر ۲۰۰۲ء) بعنوان ''منظومات''، صفحات نمبر ۳۷ تا ۴۳۔

قسط نمبر ۳، شمارہ ۹ (جنوری تا جون ۲۰۰۳ء) بعنوان ''موسیقی''، صفحات نمبر ۴۳ تا ۴۹۔

(۴۰) اس مقالے کا کچھ حصہ ''صریرِ خامہ'' شمارہ ۳ میں ''کلامِ اکبر میں سیاسی تلمیحات'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ صفحات نمبر ۱۰۲ تا ۱۰۶۔

(۴۱) مطبوعہ، لاہور، دستاویز مطبوعات، ۲۰۰۶ء، صفحات ۱۶۰۔

(۴۲) مطبوعہ، مکتبۂ جلیسانِ ادب، حیدرآباد، ۱۹۹۸ء، صفحات ۱۶۳۔

(۴۳) مطبوعہ، ادارۂ انشاء، حیدرآباد، ۲۰۰۳ء، صفحات ۱۵۲۔

(۴۴) اس مقالے کا کچھ حصہ ''صریرِ خامہ'' شمارہ۲، ۱۹۶۲ء میں ''بہزاد لکھنوی اور نشتر دہلوی'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ صفحات ۱۰۶ تا ۱۱۱۔

(۴۵) مطبوعہ، رفاہ پبلیکیشنز، کراچی، ۱۹۹۲ء، صفحات ۱۶۰۔

(۴۶) اس مقالے کا کچھ حصہ ''صریرِ خامہ'' شمارہ۲، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی ۱۹۶۲ء ''حالی کا اُسلوب اور سرسیّد'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ صفحات نمبر ۱۰۱ تا ۱۰۵۔ جب کہ ''صریرِ خامہ'' شمارہ ۳ میں ''حالی کے ایک نکتہ چیں'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ صفحات ۴۳ تا ۴۸۔

(۴۷) مطبوعہ، عدیم پبلیکیشنز، حیدرآباد، ۱۹۹۹ء، صفحات ۱۵۴۔

(۴۸) اس مقالے کا کچھ حصہ ''صریرِ خامہ'' تنقیدی ادب نمبر، ۱۹۶۷ء میں ''رشید احمد صدیقی اپنے خاکوں کی روشنی میں'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ صفحات ۲۲۵ تا ۲۳۰۔

(۴۹) مطبوعہ، پبلشر ندارد، ۱۹۹۴ء، صفحات ۱۴۴۔

(۵۰) اس مقالے کا کچھ حصہ ''صریرِ خامہ'' تنقیدی ادب نمبر ۱۹۶۷ء، میں ''سرسیّد اپنے طرزِ ادا کے آئینے میں'' کے نام سے شائع ہوا۔ صفحات نمبر ۱۵۰ تا ۱۵۳۔

(۵۱) یہ مقالہ پہلی مرتبہ ۱۹۷۱ء میں فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور سے شائع ہوا۔ اور دوسری بار ۱۹۷۶ء میں دہلی سے صفحات ۱۲۳۔

(۵۲) اس مقالے کے کچھ اجزا ''سلیم احمد بحیثیت نقاد'' کے عنوان سے کیڈٹ کالج پٹارو، لیاقت ہاؤس میگزین (تب د تاب) دوسرا شمارہ بابت ۱۹۸۸ء برصفحہ ۹ تا ۲۱ شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ روزنامہ سفیر، حیدرآباد بابت ۲۴۹-۲، مؤرخہ ۹ ستمبر ۱۹۸۸ء بروز جمعہ شائع ہوئے۔ جب کہ سلیم احمد کے ڈراموں کی توضیحی فہرست بھی ''روزنامہ سفیر'' حیدرآباد ۲۴۹-۲ مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۸۸ء بروز جمعہ شائع ہوئی (یہ معلومات مرزا سلیم بیگ صاحب نے تحریری طور پر مہیا کیں) ہمارے علم کے مطابق سلیم احمد پر لکھا جانے والا یہ پہلا مقالہ ہے۔

(۵۳) مطبوعہ، بزمِ روح رہان، سندھ اور بزمِ ادب، نوشہرو فیروز، ۲۰۰۲ء، صفحات ۱۶۰۔

(۵۴) مطبوعہ، کراچی، ۱۹۷۰ء، صفحات ۲۷۲۔

(۵۵) یہ مقالہ ''شبلی مکاتیب کی روشنی میں'' کے عنوان سے اُردو اکیڈمی، کراچی، سندھ نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔ صفحات ۳۲۷۔

(۵۶) جوہر صاحب کا خاص موضوع ''عبدالحلیم شرر'' ہے اُنھوں نے ایک مضمون ''شرر کی ایک قومی نظم'' کے عنوان سے بھی تحریر کیا جو ''صریرِ خامہ'' قومی شاعری نمبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ صفحات ۱۳۰ تا ۱۳۳۔

(۵۷) یہ مقالہ ''شفقت رضوی کی حسرت شناسی'' کے عنوان سے سہ ماہی انشاء، حیدرآباد شمارہ ۲۷، ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔ اس موقع پر دیباچہ اور کتابیات کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ پھر یہ مقالہ ''شفقت رضوی کی حسرت شناسی اور تحقیقی کاوشیں'' کے عنوان سے حیدرآباد، ادارۂ انشاء نے ۲۰۰۳ء میں کتابی صورت میں پیش کیا۔ (صفحات ۱۹۸) اس موقع پر ناشر نے

عشرت مرتضٰی کی کتاب میں شفقت رضوی کا تحریر کردہ ایک مضمون بعنوان ''دستِ دُعا کا شاعر صبا اکبرآبادی'' بھی شامل کردیا ہے۔ غالباً اسی لیے ناشر کو مقالے کا عنوان بھی تبدیل کرنا پڑا۔

(۵۸) مطبوعہ بزمِ صادق، حیدرآباد، ۱۹۹۶ء، صفحات ۱۴۳۔

(۵۹) اس مقالے کا ایک جزو ''صبا اکبرآبادی کی نعت گوئی اور نئی جہتیں'' کے عنوان سے ''جہانِ حمد'' کراچی، شمارہ ۹ ''صبا اکبرآبادی نمبر'' میں شائع ہوا۔ ص نمبر ۱۲۲ تا ۱۳۱۔

(۶۰) اس مقالے کا کچھ حصہ ''صریرِ خامہ'' شمارہ ۳، شعبۂ اُردو سندھ یونیورسٹی ''مولانا ظفر علی خاں'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ص نمبر ۱۳۰ تا ۱۳۸۔

(۶۱) مطبوعہ، پاسبان پرنٹنگ پریس، حیدرآباد، ۱۹۸۳ء، صفحات ۱۴۵۔ یہ مقالہ غیر مطبوعہ حالت میں سندھ یونیورسٹی میں موجود نہیں ہے۔

(۶۲) اس مقالے میں شامل خطوط ''یادگار خطوط''، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں کے نام'' مرتب کردہ خالد محمود، زبیر پبلیکیشنز، حیدرآباد ۱۹۹۸ء میں شامل ہیں تفصیل یہ ہے:

۱۔ مولانا احسن مارہروی۔ ص ۳۹ تا ۶۶۔

۲۔ نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، ص ۱۱۲ تا ۱۲۱۔

۳۔ علامہ سیّد سلیمان ندوی، ص ۱۹۳ تا ۲۰۱۔

۴۔ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، ص ۲۲۶ تا ۲۷۸۔

۵۔ استادالہند قاری ضیاء الدین احمد، ص ۲۷۹ تا ۲۹۴۔

۶۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ص ۳۱۶ تا ۳۲۳۔

۷۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی الہٰ آبادی، ص ۳۵۶ تا ۳۶۶۔

۸۔ کلیم جبل پوری، ص ۴۱۹ تا ۴۴۹۔

۹۔ پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، ص ۴۸۰ تا ۴۸۲۔

۱۰۔ حافظ محمود شیرانی، ص ۶۲۳ تا ۶۲۵۔

اس کے علاوہ کچھ خطوط ''ہمارے اُستاد، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں'' (مضامین: پروفیسر ڈاکٹر فضلِ حق خورشید) مرتبہ: رشید احمد خاں، ادارہ انوارِ ادب، حیدرآباد، ۲۰۰۳ء میں بھی شامل ہیں۔ تفصیل یہ ہے:

۱۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق، ص ۵۴ تا ۵۶۔

۲۔ حافظ محمود شیرانی، ص ۵۹ تا ۶۲۔

۳۔ سیّد سلیمان ندوی، ص ۶۳ تا ۷۰۔

۴۔ مولوی محمد شفیع، ص ۷۷ تا ۸۱ اور ص ۸۴ تا ۹۱۔

۵۔ سید مطیع اللہ راشد برہان پوری، ص ۹۴ تا ۹۶۔

۶۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی، ص ۱۰۰ تا ۱۲۷۔

۷۔ مولانا احسن مارہروی، ص ۱۳۹ تا ۱۵۰۔

۸۔ نواب حبیب الرحمٰن شیروانی، ص ۱۵۳ تا ۱۵۶۔

۹۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ص ۱۵۸ تا ۱۶۵۔

۱۰۔ اُستاد الہند قاری ضیا الدین احمد، ص ۱۶۷ تا ۱۷۲۔

اس کے بعد چند خطوط سہ ماہی ''نئی عبارت''، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان نمبر شمارہ نمبر ۱۲۔۱۳ میں بھی شامل ہوئے تفصیل یہ ہے:

۱۔ قاری ضیاء الدین احمد، صفحات ۴۴۲ تا ۴۴۳۔

۲۔ سید سلیمان ندوی، صفحات نمبر ۴۴۳ تا ۴۴۵۔

۳۔ مولانا احسن مارہروی، ص ۴۴۸۔

۴۔ مولوی عبدالحق، ص ۴۴۹۔

(۶۳) مطبوعہ، قصر الادب، حیدرآباد، ۱۹۹۲ء، صفحات ۱۶۴۔

(۶۴) اس مقالے کا کچھ حصہ ''انشاء'' حیدرآباد کتابی سلسلہ ۲، ۱۹۹۳ء، ص نمبر ۲۷ تا ۳۲ میں شائع ہوا۔

(۶۵) حافظ محمود شیرانی کی فارسی خدمات پر اختر شیرانی کی صاحب زادی پروین اختر شیرانی نے حضور احمد سلیم کی زیرِ نگرانی ایک ایم۔اے کا مونوگراف ۱۹۷۶ء میں تحریر کیا تھا۔ صفحات ۱۰۷۔

(۶۶) اس مقالے کا کچھ حصہ ''صریرِ خامہ'' شمارہ نمبر ۳، شعبۂ اُردو سندھ یونیورسٹی ''نذیر احمد پر سرسید کے اثرات'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ص ۹۸ تا ۱۰۱۔

(۶۷) اس مقالے کا کچھ حصہ سب سے پہلے ''قومی زبان'' کراچی، دسمبر ۱۹۶۵ء میں ''مولانا وحشت اور ان کے معاصرین'' کے عنوان سے شائع ہوا (ص۔ ۴۱ تا ۴۷) اس مقالے کا ایک اور حصہ ''وحشت کی قومی شاعری'' کے عنوان سے ''صریرِ خامہ'' قومی شاعری نمبر میں ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ (ص۔ ۹۸ تا ۱۰۱) بعد ازاں یہ مقالہ کتابی صورت میں مکتبہ کارواں، لاہور سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا، ص ۱۹۲۔

(۶۸) یہ مقالہ قسط وار سہ ماہی ''انشاء'' حیدرآباد میں شائع ہوا ہے۔ تفصیل یہ ہے:
قسط نمبر ۱، شمارہ۔ ۱، ص نمبر ۱ تا ۲۴۔ قسط نمبر ۲، شمارہ۔ ۲، ص نمبر ۲۴ تا ۴۰۔ قسط نمبر ۳، شمارہ۔ ۳، ص نمبر ۳۱ تا ۵۶۔ قسط نمبر ۴، شمارہ۔ ۴، ص نمبر ۵۷ تا ۶۷۔ قسط نمبر ۵، شمارہ۔ ۵، ص نمبر ۱۳۳ تا ۱۲۰۔ قسط نمبر ۶، شمارہ۔ ۶، ص، نمبر ۱۲۹ تا ۱۳۶۔ قسط، نمبر ۷، شمارہ۔ ۷، ص نمبر ۱۰۶ تا ۱۱۲۔ قسط نمبر ۸، شمارہ ۱۰۔۱۱، ص نمبر ۲۴۰ تا ۲۴۹۔ قسط نمبر ۹ (آخری قسط)، شمارہ ۱۲۔۱۳، ص نمبر ۷۵ تا ۸۰۔

(۶۹) ڈاکٹر نجم الاسلام کا یہ مقالہ ''دین و ادب'' کے نام سے ۱۹۸۹ء میں ادارۂ اُردو، حیدرآباد سے شائع ہوا۔ صفحات ۲۵۶۔

اس مقالے کا کچھ حصہ ''صریرِ خامہ'' شعبۂ اُردو سندھ یونیورسٹی، شمارہ ۲، ۱۹۶۲ء میں ''اُردوئے قدیم پر بزرگانِ دین کے اثرات'' کے عنوان سے بھی شائع ہوا۔ ص ۹۷ تا ۸۴

(۷۰) اس مقالے کا کچھ حصہ ''صریرِ خامہ'' قومی شاعری نمبر، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، ۱۹۶۶ء، میں ''جنگ اور شعرا'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ص نمبر ۹۸ تا ۱۰۱۔

(۷۱) اس مقالے کے چند اجزا ''صریرِ خامہ'' شعبۂ اُردو سندھ یونی ورسٹی، شمارہ۔۳، میں بعنوان ''مقدمۂ شعر و شاعری'' شائع ہوئے، ص ۵۴ تا ۶۳۔

(۷۲) اس مقالے کے کچھ حصے سہ ماہی ''عبارت'' میں شائع ہوئے۔ تفصیل یہ ہے:

قسط نمبر ۱، شمارہ۔۱، اگست تا اکتوبر ۱۹۹۵ء، ص نمبر ۵۱ تا ۵۴۔

قسط نمبر ۲، شمارہ۔۲، نومبر تا جنوری ۹۶۔۱۹۹۵ء، ص نمبر ۴۷ تا ۵۳۔

(۷۳) مطبوعہ نیشنل پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۷۰ء، صفحات ۵۱۲۔

(۷۴) اس مقالے کا کچھ حصہ سہ ماہی ''انشاء'' حیدرآباد، شمارہ ۲۱۔۲۲، اکتوبر ۱۹۹۸ء، ص نمبر ۹ تا ۲۹ میں شائع ہوا۔

(۷۵) مطبوعہ محبوب پریس، حیدرآباد، ۱۹۶۷ء، صفحات ۲۵۳۔ غیر مطبوعہ حالت میں یہ مقالہ سندھ یونیورسٹی میں موجود نہیں ہے۔

(۷۶) اس مقالے کا کچھ حصہ ''صریرِ خامہ'' شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، شمارہ ۲، ۱۹۶۲ء میں بعنوان ''میر سجاد اکبرآبادی'' شائع ہوا۔ ص نمبر ۸۵ تا ۱۰۰۔

(۷۷) بحوالہ ''منزل بہ منزل'' مرتبہ محمد عبدالستار طاہر، حیدرآباد، انٹرنیشنل پبلیکیشنز، ۱۹۹۱ء، ص نمبر ۹۰ کے مطابق اس کا ترجمہ ''فقہ اسلامی'' کے نام سے ہوا۔

(۷۸) اس مقالے کا کچھ حصہ ''صریرِ خامہ'' شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، شمارہ ۲، ۱۹۶۲ء، میں ''تنقید'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ص نمبر ۶۳ تا ۶۷۔

(۷۹) ڈاکٹر سعدیہ نسیم اپنے مضمون ''اُردو کے چند کمیاب میلاد نامے'' میں لکھتی ہیں کہ: سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں آنسہ سیّدہ رئیس فاطمہ نے مجلسی میلاد ناموں کے موضوع پر ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان صاحب کی زیرِ نگرانی ایم۔اے کا تحقیقی مقالہ لکھا اس مقالے کو ''تحفۂ ثانیِ کوثر'' کے تاریخی نام سے موسوم کیا گیا ہے''۔ (صریرِ خامہ ''نعت نمبر'' ۱۹۸۷ء ص نمبر ۱۴۵)۔

(۸۰) اس مقالے کا کچھ حصہ ''صریرِ خامہ'' شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، ۱۹۶۲ء، شمارہ ۲، میں ''دورِ حاضر میں اسلام'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ص نمبر ۷۵ تا ۸۷۔

(۸۱) مطبوعہ قصر الادب، حیدرآباد، ۲۰۰۲ء، صفحات ۱۹۷۔

(۸۲) اس مقالے کے کچھ اجزا روزنامہ ''پاسبان'' حیدرآباد، جلد نمبر ۴۲، شمارہ نمبر ۱۹۵ اور جلد نمبر ۴۲، شمارہ نمبر ۳۲۸، ۲۰ جولائی ۱۹۹۹ء تا ۳۰ نومبر ۱۹۹۹ء ہر ہفتے اور منگل کے دن قسط وار شائع ہوئے۔ (یہ معلومات وثیق الرحمٰن صابر نے تحریری طور

پر مہیا کیں)۔اس کے بعد اس مقالے کا کچھ حصہ سہ ماہی ''نئی عبارت'' حیدرآباد ''ادب نمبر'' میں مدیر کے درج ذیل نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔صفحات نمبر ۲۷۴ تا ۲۹۱۔

''وثیق الرحمن صابر نے ۱۹۸۳ء میں ایم۔اے اُردو کے دوران'' حیدرآباد کی ادبی تنظیمیں اور فروغ ادب میں ان کا کردار'' مقالہ لکھا تھا جو تا حال کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا۔ادارہ اس طویل مقالے میں سے ادبی تنظیموں کا صرف تعارف پیش کر رہا ہے۔ضمیمے کا اضافہ ادارے کی جانب سے ہے۔تاکہ مضمون کے حوالے تا حال مکمل ہو سکیں''۔

(۸۳) اس مقالے کا کچھ حصہ سہ ماہی ''انشاء'' حیدرآباد جنوری تا مارچ ۲۰۰۲ء، ڈاکٹر نجم الاسلام نمبر میں شائع ہوا۔صفحات نمبر ۱۶۱ تا ۱۷۹۔

(۸۴) مطبوعہ، حیدرآباد، ناشر کا نام ندارد، ۱۹۶۱ء، صفحات ۲۸۸۔

(۸۵) اس مقالے کے کچھ اجزاء ''جامِ نو'' کراچی، میں ''اُجڑے ہوئے میکدے کے رنداں'' کے عنوان سے ۱۹۷۶ء تا ۱۹۷۸ء قسط وار شائع ہوئے۔

(۸۶) یہ مقالہ قسط وار کتابی سلسلہ ''تحریر'' میرپورخاص سے شائع ہوا ہے۔اب تک اس کی آٹھ قسطیں شائع ہو چکی ہیں، تفصیل یہ ہے:

قسط نمبر ۱، شمارہ۔۱، بعنوان، ''میرپورخاص ایک تعارف''۔

قسط نمبر ۲، شمارہ۔۲، بعنوان، ''میرپورخاص کی ادبی تنظیمیں''۔

قسط نمبر ۳، شمارہ۔۳، بعنوان، ''میرپورخاص کی ادبی سرگرمیاں''۔

قسط نمبر ۴، شمارہ۔۴، ایضاً۔قسط نمبر ۵، شمارہ۔۵، ایضاً۔قسط نمبر ۶، شمارہ۔۶، ایضاً۔قسط نمبر ۷ شمارہ۔۷، ایضاً۔ قسط نمبر ۸، شمارہ۔۸، ایضاً۔

(۸۷) مطبوعہ، ادارہ علمی، حیدرآباد، ۱۹۹۵ء، صفحات ۱۵۷۔

(۸۸) اس مقالے کی تلخیص یادگاری مجلّہ ''کل پاکستان گولڈن جوبلی مشاعرہ ۱۹۹۷ء''، فاران کلب انٹرنیشنل، حیدرآباد ''شاخ'' میں شائع ہوئی۔اس کے بعد یہی تلخیص سہ ماہی ''نئی عبارت''، حیدرآباد، شمارہ ۲۳، ۲۰۰۳ء صفحات نمبر ۳۵۴ تا ۳۶۳ میں شائع ہوئی۔

(۸۹) مطبوعہ، لاہور، مرکزی اُردو بورڈ، ۱۹۶۹ء، صفحات ۳۲۵۔

(۹۰) خان اسلام اختر صاحب اور عبدالجمیل صاحب کے مقالات، مرکزی اُردو بورڈ، لاہور، نے ۱۹۷۰ء میں یکجا صورت میں شائع کیے صفحات ۵۰۷۔

(۹۱) ایضاً

(۹۲) یہ اشاریہ قسط وار سہ ماہی ''انشاء'' حیدرآباد سے شائع ہوا ہے تفصیل یہ ہے:

قسط نمبر ۱، شمارہ۔۱، صفحات نمبر ۱ تا ۲۴۔ قسط نمبر ۲، شمارہ۔۲، صفحات نمبر ۲۵ تا ۴۰۔ قسط نمبر ۳، شمارہ۔۳، صفحات نمبر ۴۱ تا ۵۶۔ قسط نمبر ۴، شمارہ۔۴، صفحات ۵۷ تا ۸۰۔ قسط نمبر ۵، شمارہ۔۵، صفحات نمبر ۱۲۱ تا ۱۲۸۔ قسط نمبر ۶،

شمارہ۔۶،صفحات نمبر۱۳۷تا۱۴۴۔ قسط نمبر۷، شمارہ۔۷، صفحات نمبر۱۲۱تا۱۲۸۔ قسط نمبر۸، شمارہ۔۸۔۹،صفحات نمبر۸۹تا۹۵،قسط نمبر۹،شمارہ۔۱۴۔۱۵،صفحات نمبر۱۲۹تا۱۴۰۔قسط نمبر۱۰،شمارہ۔۱۸۔۱۹،صفحات نمبر۱۵۸تا۱۶۷۔ قسط نمبر۱۱،شمارہ۔۲۱۔۲۲،صفحات نمبر۹۲تا۱۰۵۔ قسط آخری شمارہ۔۲۳،۲۴۔۲۵،صفحات نمبر۱۳۱تا۱۳۹۔

کتابیات

۱۔ احمر رفاعی، ڈاکٹر: ''جگر مرادآبادی آثار وافکار''، کراچی، انجمن ترقی پاکستان، ۱۹۷۹ء۔

۲۔ اسرار الحق خانزادہ: ''خانزادہ سمیع الوری شخصیت وفن''، نوشہرو فیروز، بزمِ روح رہاڑ، بزمِ ادب، ۲۰۰۲ء۔

۳۔ اسلام اختر۔عبدالجمیل: ''سندھ میں اُردو مطبوعات''، لاہور، مرکزی اُردو بورڈ، ۱۹۶۹ء۔

۴۔ اصلاحی، شرف الدین، ڈاکٹر: ''اُردو سندھی کے لسانی روابط''، لاہور، مرکزی اُردو بورڈ، ۱۹۷۱ء۔

۵۔ اعجاز راہی، ڈاکٹر: ''اُردو افسانے میں علامت نگاری''، راول پنڈی، ریز پبلیکیشنز، ۲۰۰۳ء۔

۶۔ پروین اختر، شیرانی: ''حافظ محمود شیرانی کی فارسی خدمات''، (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔اے، فارسی) سندھ یونیورسٹی، جام شورو، ۱۹۷۶ء۔

۷۔ جاوید اقبال، سید: ''فضل احمد کریم فضلی اور اُن کا فن''، حیدرآباد، قصر الادب، ۱۹۹۲ء۔

۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: ''تاریخ ادب اُردو، جلد اوّل، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء۔

۹۔ عامل دہلوی: ''دیوانِ عامل دہلوی (حبیبہ حسین، ترتیب وتدوین)، حیدرآباد، محبوب پریس، ۱۹۶۷ء۔

۱۰۔ حِنا عنبرین: ''خدا بخش لائبریری جرنل کی علمی وتحقیقی خدمات کا جائزہ''، حیدرآباد، ادارہ علمی، ۱۹۹۵ء۔

۱۱۔ خالد محمود: ''یادگار خطوط''، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کے نام'' حیدرآباد، زبیر پبلیکیشنز، ۱۹۹۸ء۔

۱۲۔ دردانہ جاوید: ''پاکستان کی منتخب افسانہ نگار خواتین''، حیدرآباد، قصر الادب، ۲۰۰۲ء۔

۱۳۔ رشید احمد خان: ''ہمارے اُستاذ''، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان (مجموعۂ مضامین، ڈاکٹر فضلِ حق خورشید)، حیدرآباد، انوارِ ادب، ۲۰۰۳ء۔

۱۴۔ رونق افروز: ''حضور احمد سلیم شخصیت وفن''، حیدرآباد، عدیم پبلیکیشنز، ۱۹۹۹ء۔

۱۵۔ ہاشمی، نجی احمد، ڈاکٹر: ''شبلی کا ذہنی ارتقا''، کراچی، مجلس یادگار ہاشمی، ۱۹۹۰ء۔

۱۶۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر: ''اُردو میں اُصولِ تحقیق''، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء۔

۱۷۔ سلطان محمود، ڈاکٹر: ''خطباتِ گارسیں دتاسی حواشی وتعلیقات''، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء۔

۱۸۔ شاہ انجم: ''جلیل قِدوائی شخصیت وفن''، کراچی، رفاہ پبلیکیشنز، ۱۹۹۲ء۔

۱۹۔ شکیل احمد خان: ''سیّد محمد صادق علی صادق دہلوی شخصیت وفن''، حیدرآباد، بزمِ صادق، ۱۹۹۶ء۔

۲۰۔ عطش دُرّانی: مرتب ''پاکستانی اُردو کے خدوخال''، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۸ء۔

۲۱۔ طاری، طارق حسن: ''ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کے مقدمات''، حیدرآباد، پاسبان پرنٹنگ پریس، ۱۹۸۳ء۔

۲۲۔ ظفر اقبال ڈاکٹر: ''اُردو میں تاریخ نویسی'' کراچی، ادارۂ یادگار احسان، ۲۰۰۴ء۔

۲۳۔ ظفر حسن، ڈاکٹر: ''سرسید اور حالّی کا نظریۂ فطرت''، لاہور، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۹۰ء۔

۲۴۔ عزیز انصاری، ڈاکٹر: ''اُردو اور راجستھانی بولیاں''، کراچی، حرا فاؤنڈیشن، ۲۰۰۰ء۔

۲۵۔ عشرت مرتضٰی: ''شفقت رضوی کی حسرت شناسی اور تحقیقی کاوشیں''، حیدرآباد، ادارۂ انشاء، ۲۰۰۳ء۔

۲۶۔ عفت افضل: ''بانو قدسیہ شخصیت و فن''، حیدرآباد، ادارۂ انشاء، ۲۰۰۳ء۔

۲۷۔ غلام حسین، ذوالفقار، ڈاکٹر: ''اُردو شاعری کا سیاسی پس منظر''، پنجاب یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۷ء۔

۲۸۔ کریم الدین احمد، ڈاکٹر: ''امیر مینائی اور اُن کے تلامذہ''، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۸۲ء۔

۲۹۔ کشفی، ابوالخیر، ڈاکٹر: ''اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، کراچی، ادبی پبلیکیشنز، ۱۹۷۵ء۔

۳۰۔ محمد اسحاق شمس: ''شبلی کا تنقیدی شعور''، کراچی، ۱۹۷۰ء۔

۳۱۔ محمد اقبال احمد خان، ڈاکٹر: ''اصغر گونڈوی آثار و افکار''، لاہور، مغربی پاکستان، اکیڈمی، ۱۹۹۴ء۔

۳۲۔ محمد انیس خان: ''حیاتِ اختر''، حیدرآباد، مکتبۂ جلیسانِ ادب، ۱۹۸۹ء۔

۳۳۔ محمود الرحمٰن: ''اُردو میں بچوں کا ادب''، کراچی، نیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۰ء۔

۳۴۔ محمود الرحمٰن: ''جنگِ آزادی کے اُردو شعرا''، اسلام آباد، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، ۱۹۸۶ء۔

۳۵۔ مسعود الرحمٰن: ''رئیس امروہوی بحیثیت شاعر''، پبلیشر ندارد، ۱۹۹۴ء۔

۳۶۔ مشتاق علی جعفری: ''سندھ کے موجودہ اُردو شعراء''، حیدرآباد، ناشر کا نام ندارد، ۱۹۶۱ء۔

۳۷۔ معین الرحمٰن، ڈاکٹر: ''اُردو تحقیق یونیورسٹیوں میں''، لاہور، الوقار پبلیکیشنز، ۱۹۸۹ء۔

۳۸۔ معین الرحمٰن، ڈاکٹر: ''غالب کا علمی سرمایہ''، لاہور، یونیورسل بکس، ۱۹۸۹ء۔

۳۹۔ منہاج الدین، ڈاکٹر: ''سندھ کے اُردو نثر نگار''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی، اُردو، سندھ یونی ورسٹی، جام شورو، ۱۹۷۳ء۔

۴۰۔ مہناز ضمیر: ''اُمراؤ طارق شخصیت و فن''، حیدرآباد، مکتبۂ جلیسانِ ادب، ۱۹۹۸ء۔

۴۱۔ نجم الاسلام: ''دین و ادب''، حیدرآباد، ادارۂ اُردو، ۱۹۸۹ء۔

۴۲۔ نظامی، فخر الدین: ''مثنوی نظامی دکنی المعروف کدم راؤ پدم راؤ''، مرتبہ: جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستان، انجمن ترقی اُردو، ۱۹۷۳ء۔

۴۳۔ نظیر حسنین زیدی، ڈاکٹر: ''مولانا ظفر علی خان بحیثیت شاعر''، پاکستان، انجمن ترقی اُردو، ۱۹۸۰ء۔

نظیر حسنین زیدی، ڈاکٹر: ''مولانا ظفر علی خان بحیثیت صحافی''، کراچی، مکتبۂ اُسلوب، ۱۹۸۵ء۔

نظیر حسنین زیدی، ڈاکٹر: ''مولانا ظفر علی خان احوال و آثار''، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۶ء۔

۴۴۔ نور محمد، ڈاکٹر: ''مولانا حامد حسن قادری سوانح حیات اور ادبی خدمات''، لاہور، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۹۹ء۔

۴۵۔ وفا راشدی، ڈاکٹر: ''اُردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا حصہ''، لاہور، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۹۴ء۔

رسائل و جرائد

۱۔ ماہ نامہ ''اخبارِ اُردو''، اسلام آباد، شمارہ، فروری ۱۹۹۷ء، جون ۲۰۰۲ء، اکتوبر ۲۰۰۲ء، مارچ۔اپریل ۲۰۰۳ء۔

۲۔ سہ ماہی ''اُردو''، کراچی، شمارہ ۱۔

۳۔ سہ ماہی ''الزبیر''، بھاول پور، شمارہ ۲۔۳

۴۔ ''الماس'' شمارہ ۳۔۴، شعبۂ اُردو، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیر پور، میرس، سندھ۔

۵۔ سہ ماہی ''انشاء''، حیدرآباد، شمارہ نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۸، ۱۹، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵۔ ڈاکٹر نجم الاسلام نمبر، جنوری تا مارچ ۲۰۰۲ء۔

۶۔ روزنامہ ''پاسبان''، حیدرآباد، ۲۰ جولائی ۱۹۹۹ء تا ۳۰ نومبر ۱۹۹۹ء۔

۷۔ سہ ماہی ''پہچان''، میر پور خاص، کتابی سلسلہ ۷۔۸۔

۸۔ سہ ماہی ''تحریر''، میر پور خاص، شمارہ ۱ تا ۸۔

۹۔ شعبہ جاتی مجلّہ ''تحقیق''، شمارہ ۱، ۲، ۳، ۴، ۱۰، ۱۱۔۱۲، ۱۳، شعبۂ اُردو، سندھ یونی ورسٹی، جام شورو۔

۱۰۔ روزنامہ ''جنگ''، کوئٹہ، ۱۶۔نومبر ۱۹۹۶ء۔

۱۱۔ سہ ماہی ''جہانِ حمد''، صبا اکبرآبادی نمبر، کراچی، شمارہ ۹۔

۱۲۔ سہ ماہی ''راونجات''، نعت نمبر، شمارہ ۳، کراچی، ۲۰۰۳ء۔

۱۳۔ سہ ماہی ''صحیفہ''، لاہور، شمارہ ۴۳، ۱۹۶۸ء۔

۱۴۔ شعبہ جاتی مجلّہ ''صریرِ خامہ''، شمارہ ۲، ۱۹۶۲ء، ۳، سنہ ندارد، قومی شاعری نمبر ۱۹۶۶ء، تنقیدی ادب نمبر، ۱۹۶۷ء، نعت نمبر ۱۹۷۸ء۔

۱۵۔ سہ ماہی ''نئی عبارت''، حیدرآباد، ''حیدرآباد نمبر''۔ شمارہ ۱، ۲، ۱۲۔۱۳، ۳۲۔

۱۶۔ ''نقوش''، لاہور، شمارہ ۱۰۵، ۱۱۱، ۱۱۸، جنوری ۱۹۸۴ء۔

☆☆☆

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ ترین

ادبی تحقیق کی روایت میں
بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان کا کردار

''سات دریاؤں کی سرزمین'' کے مصنف مرزا ابنِ حنیف لکھتے ہیں کہ: سکندر کے حملے سے بھی ہزار، بارہ سو برس قبل ملتان کا نام ''ویل استھان''، ''مہاویل استھان''، ''مول استھان'' یا پھر ان سے ملتا جلتا ہی کوئی نام ہوگا کہ یہی نام ''رگ وید'' میں ان شاعروں نے لیے ہیں، جو اس خطے میں رہتے تھے''۔ (''تین پُراَسرار خطے اور ملتان'' ص ۲۳۶)۔

گویا سرزمینِ ملتان اپنی تاریخی قدامت کے ساتھ ساتھ دفینے کی صورت میں اس خطے میں موجود ہے، جو سنجیدہ محققین اور اہلِ علم کا منتظر ہے۔ لاہور تو مغل، سکھ، انگریز اور مقامی سب ہی حکمرانوں کا منظورِ نظر رہا، مگر ملتان وسائل کے حوالے سے پس ماندہ سے پس ماندہ تر ہوتا گیا، اس لیے آج بڑی ندامت سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے شہر میں کوئی ایک سرکاری یا نیم سرکاری، معیاری کتب خانہ نہیں، ادبی جریدہ نہیں، مگر نامساعد حالات کے باوجود علمی و ادبی تحقیق و تنقید کے حوالے سے ایک نیم باقاعدہ سی روایت موجود رہی ہے اور اس روایت کو تسلسل دینے میں چند شخصیتوں، ادبی انجمنوں، اشاعتی اداروں کے بعد سب سے اہم کردار ''بہاءالدین زکریا یونیورسٹی''، ملتان کے شعبۂ اُردو کا ہے۔

ملتان یونیورسٹی کا قیام ۱۹۷۵ء میں عمل میں آیا۔ مگر گورنمنٹ کالج، ملتان میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے زیرِ انصرام ایم۔اے اُردو کی کلاس کا اجراء ۱۹۶۳ء میں ہوا۔ اس طرح ملتان یونیورسٹی کے قیام سے قبل ایم۔اے اُردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور کے تحت شروع ہوا تو وہ تمام سہولتیں جو کسی شعبے کے لیے ضروری ہوتی ہیں، اُس سے یہ شعبہ کسی حد تک محروم رہا۔ البتہ گورنمنٹ کالج، ملتان (سابقہ ایمرسن کالج) کی لائبریری، ایک قابلِ قدر لائبریری رہی ہے۔ اس کے باوجود ۱۹۶۷ء میں اس شعبے میں جب نامور ماہرِ لسانیات، پروفیسر خلیل صدیقی، صدرِ شعبہ ہوئے تو ان کی نگرانی میں اس شعبے کے پانچ طالب علموں (انوار احمد، فخر بلوچ، طلعت نشاط، عبدالرؤف اور نصرت فاطمہ) نے ایم۔اے کی سطح پر تحقیقی مقالات لکھنے کا آغاز کیا اور اس سے اگلے سال ایک طالب علم اصغر ندیم سیّد نے تحقیقی مقالہ لکھا۔ مگر تحقیق کی سہولیات کی

کمی کے باعث اس میں تسلسل نہ رہا۔ لیکن ستمبر ۱۹۷۵ء میں جب باقاعدہ ملتان یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو گورنمنٹ کالج، ملتان کا شعبۂ اُردو بھی یونیورسٹی کی مستعار عمارت میں اپنے دو اساتذہ سیّد افتخار حسین شاہ (صدرِ شعبہ) اور ڈاکٹر اے بی اشرف کے ساتھ منتقل ہوگیا۔ اس طرح اس شعبے میں ایم۔اے کی سطح پر ہر سال باقاعدہ تحقیقی مقالات لکھنے کا جو سلسلہ شروع ہوا، اس میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آج اس شعبے میں ایم۔اے، ایم۔فل اور پی ایچ ڈی کی سطح کی تحقیق ہو رہی ہے۔

ملتان میں تحقیق کی روایت خاصی پرانی ہے اگرچہ ابتدا میں اس شعبے کا دائرۂ کار محدود تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس میدان میں شعبے نے ہر طرح کے موضوعات پر تحقیق کا کام شروع کیا ہے۔ اب تک شعبے میں ایم۔اے کی سطح پر ۲۵۲ مقالات لکھے جا چکے ہیں، ایم۔فل کے ۲۵ کامیاب اُمیدوار مقالات لکھ چکے ہیں جب کہ اس سال ایم۔فل کے ۱۲ طالب علم ایسے موضوعات پر کام کر رہے ہیں، جن کی فہرست اس مضمون میں شامل ہے۔ پی ایچ ڈی کے ۳۴ مقالات پر ڈگری دی جا چکی ہے۔ دو مقالات تنقیحی مراحل میں ہیں۔ جب کہ ۲۱ موضوعات پر رجسٹریشن ہو چکی ہے۔ (فہرست منسلک ہے)

جہاں تک تحقیقی مقالات کے موضوعات کا تعلق ہے، وہ شخصیات، لسانیات، افسانہ، ناول، ڈراما، تنقید، سفرنامہ، مزاح، خاکہ نگاری، داستان، سوانح عمری، تاریخ ادب، شاعری، آپ بیتی، انشائیہ، فرہنگ و اشاریہ کے علاوہ انگریزی ادب کی اہم کتب کے ترجمے پر مشتمل ہیں۔ ان موضوعات میں سب سے زیادہ شخصیت نگاری پر تحقیق ہوئی۔ یہ شخصیات نامور شعرا و ادبا پر مشتمل ہیں، جن میں ملتان کے اہم شعرا، ادیب اور نقاد بھی شامل ہیں۔ ایسے موضوعات پر کام کرنے سے تحقیق کا معیار متاثر ہوا، کیوں کہ جن طالب علموں نے زندہ شخصیات پر تحقیق کی وہ بیش تر انھی کی فراہم کردہ معلومات و مواد پر مشتمل تھی اور جو شخصیات اس دنیا میں نہیں ان سے متعلق ورثاء سے میسر آنے والے مواد ہی پر اکتفا کیا گیا اور پھر اس سلسلے میں یہ قباحت بھی تھی کہ پاکستان کی دوسری جامعات میں بھی بیش تر انھی شخصیات پر تحقیقی مقالات لکھے گئے جس نے جامعات میں تحقیق کے حوالے سے سہولت پسندی کے تاثر کو فروغ دیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ضرورت اس امر کی تھی کہ:

- i۔ پاکستان کی تمام جامعات میں ہونے والے تحقیقی کام کی فہرستیں ہر جامعہ میں ہوں تاکہ تکرار نہ ہو۔
- ii۔ موضوعات میں تنوع ہو، شخصیت و فن پر تحقیق سے حتی الامکان گریز کیا جائے اور ادبی مسائل، رفتار اور تاریخِ ادب کے حال و ماضی سے متعلق تشنہ گوشوں کو سامنے لایا جائے۔
- iii۔ قدیم کتب رمسودات کی ترتیب و تدوینِ متن کی طرف توجہ دی جائے۔
- iv۔ اُردو ادب میں ہونے والی تبدیلیوں کا عمرانی، سیاسی، تہذیبی و ثقافتی پس منظر میں مطالعہ کیا جائے۔

-۷ طالب علموں میں عملی تحقیق سے دل چسپی پیدا کی جائے۔

شعبۂ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان نے تحقیق کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے جو عملی اقدامات کیے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

-i محض فن و شخصیت پر ہی تحقیق کی حوصلہ شکنی کی اور ایسے موضوعات تحقیق کے لیے منتخب کیے جن میں تحقیق کی ضرورت تھی مثلاً: اُردو کے ادبی جرائد کا مختلف ادبی تحریکوں اور رجحانات کے فروغ میں اہم کردار رہا ہے۔ خاص طور پر ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ پیدا ہونے والی تبدیلیاں اہم ہیں۔ چنانچہ اہم ادبی رسائل کی خدمات کے حوالے سے ''نگار''، ''ادب لطیف''، ''نقوش''، ''تخلیق''، ''صحیفہ''، ''مجلہ عثمانیہ''، ''سویرا'' پر کام ہو چکا ہے اور ''فنون''، ''سیپ''، پر پی ایچ ڈی کی سطح پر کام ہو رہا ہے۔

-ii شعبے نے ۱۹۹۳ء سے باقاعدہ ایم۔فل کی کلاس شروع کی، اب تک ۲۵ طالب علم ایم۔فل کر چکے ہیں اور اس وقت زیرِ تعلیم ۱۲ طالب علم، تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں اور طالب علم دوسرے سمسٹر میں پڑھ رہے ہیں۔

-iii شعبے میں بی۔اے، ایم۔اے اور ایم۔فل کا نصاب کم و بیش پانچ سال بعد تبدیل کیا جاتا ہے۔ اب تک پانچ مرتبہ ایم۔اے کا نصاب تبدیل ہو چکا ہے۔ آج کل نصاب کو سمسٹر سسٹم کے تحت جدید دور کے تقاضوں کے مطابق تبدیل کیا گیا ہے، جس میں کمپیوٹر کا لازمی پرچہ شامل ہے۔

-iv تحقیقی موضوعات کے سلسلے میں ماہرین کی آرا کے سلسلے میں مشاورت کے دائرے کو وسیع کیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ملک کی ہر جامعہ سے ماہرین کی رائے لی جاتی ہے۔

-v ایم۔فل کو ہر ماہ اور پی ایچ ڈی کے رجسٹرڈ اسکالرز کو ہر تین ماہ بعد سیمینار کے لیے پابند کیا جاتا ہے۔

-vi مقالے کی تکمیل کے بعد ڈگری دینے سے پہلے ہر پی ایچ ڈی اسکالر کے لیے مجلسی دفاع ضروری ہے۔ جس میں شعبے کے ایم۔اے، ایم۔فل کی سطح کے طالب علموں کے علاوہ پی ایچ ڈی کے رجسٹرڈ اسکالرز کے علاوہ یونیورسٹی اور کالج کے اساتذہ بھی شریک ہوتے ہیں۔

-vii شعبے میں ''پروفیسر خلیل صدیقی ریسرچ لائبریری'' قائم کی گئی ہے، جو اگرچہ بہت بڑی لائبریری نہیں ہے، تاہم ملتان جیسے علاقے میں لوگوں کو تحقیق کی سہولت فراہم کرنے میں اس کا اہم حصہ ہے۔ اس لائبریری میں پروفیسر خلیل صدیقی کے ذاتی کتب خانے کے علاوہ مختلف اہلِ علم حضرات کے کتب کے عطیے شامل ہیں۔ جن میں قدرت اللہ شہاب (مرحوم)، پروفیسر نصیر صدیقی (مرحوم)، محمد نصیر شادانی (مرحوم) اور ڈاکٹر مہر عبدالحق (مرحوم) کے ورثاء کا ایثارِ علمی شامل ہے،

جب کہ جناب مشفق خواجہ نے ''گوشۂ قدرت نقوی'' کے نام پر کتب کی پہلی قسط دی ہے جو ۶۰ کتب پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر معین الدین عقیل، افتخار حسین شاہ، ڈاکٹر اے بی اشرف، اقبال ساغر صدیقی، ڈاکٹر فاروق عثمان اور ڈاکٹر محمد امین نے بھی اپنے ذاتی کتب خانے سے اہم کتابیں بطور عطیہ دی ہیں۔ ملتان میں غالبیات کے عظیم ذخیرے کے حوالے سے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے پروفیسر لطیف الزماں خاں نے ''گوشۂ رشید صدیقی'' کے نام سے فکشن اور اس پر ہونے والی تنقید کے حوالے سے پاکستان اور ہندوستان سے شائع ہونے والی بہت سی کتب عنایت کی ہیں۔ جن میں سے بیش تر کتب کے اوّلین ایڈیشن ہیں۔

viii- شعبے میں کمپیوٹر، انٹرنیٹ کی سہولت موجود ہے، اس وقت شعبۂ اُردو میں دس کمپیوٹر موجود ہیں۔ ان کے علاوہ بیس کمپیوٹرز پر مشتمل لیب بھی ہے۔ عنقریب ان کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ تمام کمپیوٹرز Net working کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔

ix- ہماری یونیورسٹی میں ریسرچ پراجیکٹ کے حوالے سے ملنے والی گرانٹ جو اکثر سائنس کے اساتذہ کو ملتی تھی، لیکن شعبۂ اُردو کے اساتذہ نے چھے ماہ یا ایک سال کے ایسے ریسرچ پراجیکٹ بنائے ہیں، جن کا شعبے میں ہونے والی تحقیق سے اساسی تعلق ہے۔ اس وقت شعبے کا ہر اُستاد کسی نہ کسی ایسے ریسرچ پراجیکٹ پر کام کر رہا ہے۔ ہائر ایجوکیشن (HEC) نے حال ہی میں ڈاکٹر روبینہ ترین کا ریسرچ پراجیکٹ بہ عنوان "A History of Urdu Literature in Multan" منظور کیا ہے۔ جو دو برس پر محیط ہے۔ ہمارے شعبے میں آٹھ اُستاد ہیں اور سب پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے چکے ہیں۔

x- تحقیقی سرگرمیوں کے فروغ میں تمام اساتذہ دل چسپی لیتے ہیں۔ اُن کے تحقیقی و تنقیدی مقالات ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔

اس وقت شعبے میں اشاعتی کام ہو رہے ہیں جس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

i- پی ایچ ڈی کی سطح پر بیشتر مقالات شائع ہو چکے تھے۔ جو کہ ''مقتدرہ قومی زبان''، ''سنگِ میل پبلی کیشنز''، ''ہمدرد فاؤنڈیشن'' کے علاوہ ''بیکن بکس'' ملتان نے شائع کیے تھے۔ اس وقت جو مقالات شائع نہیں ہوئے، ان کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ اب تک شعبے کی درج ذیل کتب شائع ہو چکی ہیں:

۱۔ ''اُردو افسانہ اور عورت'': ڈاکٹر عصمت جمیل، ۲۰۰۱ء۔

۲۔ ''علامہ طالوت'': ڈاکٹر مختار ظفر، ۲۰۰۲ء۔

۳۔ ''اُردو افسانہ اور اساطیر'': ڈاکٹر قاضی عابد، ۲۰۰۲ء۔

۴۔ ''پئے خوب تر نگارے'': ڈاکٹر ممتاز کلیانی، ۲۰۰۲ء۔

۵۔ ''خطباتِ اقبالیات'': ڈاکٹر انوار احمد رڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۳ء۔

۶۔ ''ملتان میں جدید اُردو نظم کی روایت'': شازیہ عنبرین رانا، ۲۰۰۳ء۔

۷۔ ''حوالہ (تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ)'': ڈاکٹر سیّد عامر سہیل، ۲۰۰۳ء۔

۸۔ ''نادر ذخیرۂ غالبیات'': فرح ذبیح، ۲۰۰۳ء۔

۹۔ ''ابراہیم جلیس۔ شخصیت اور فن'': ڈاکٹر امتیاز بلوچ، ۲۰۰۴ء۔

۱۰۔ ''مطالعہ'' (تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ): ڈاکٹر شگفتہ حسین، ۲۰۰۴ء۔

۱۱۔ ''منٹو کی بیس کہانیاں'' (مرتبہ): ڈاکٹر اے بی اشرف /ڈاکٹر انوار احمد، ۰۴۔۲۰۰۳ء۔

۱۲۔ ''نتائج فکر'' (تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ): شوکت نعیم قادری، ۲۰۰۴ء۔

ii- ملتان یونیورسٹی میں پہلی مرتبہ ہماری فیکلٹی کا ریسرچ جرنل شائع ہو رہا ہے۔ جس کے چار شمارے شائع ہو چکے ہیں، اس سلسلے میں تحقیق کے معیار و اُصول کو سامنے رکھا گیا ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آئندہ برس شعبۂ اُردو کا اپنا ریسرچ جرنل ہو۔

شعبۂ اُردو، ملتان یونیورسٹی کے تحقیقی کام کے حوالے سے ایک مختصر جائزہ آپ کے سامنے ہے۔ ہماری یہ کوشش ہوگی کہ آئندہ تحقیقی منصوبوں میں معیار کی بہتری کے لیے اقدامات ہوں، اُن میں سب سے پہلے:

i- ریسرچ لائبریری کو بہتر بنانے کے لیے ملک کے ہر کونے سے ایسی کتب و جرائد کو حاصل کیا جائے جو ہمارے موجودہ اور آئندہ تحقیقی منصوبوں کے لیے ضروری ہیں۔ اسی طرح مخطوطات دریافت اور حاصل کر کے اُن کی تدوین کا کام کرایا جائے۔

ii- تحقیق کے طالب علموں کو کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور کمپوزنگ کی سہولت حاصل ہو۔

iii- اس وقت شعبے میں پی ایچ ڈی اساتذہ موجود ہیں، جو ادب کے مختلف شعبوں میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ نہ صرف خود بھی تحقیقی کام کر رہے ہیں بلکہ اُن لوگوں کو جو تحقیق سے دلچسپی رکھتے ہیں، اس حوالے سے سہولیات بہم پہنچانے میں کوشاں ہیں، مگر ہماری کوشش ہے کہ وہ انا کے گنبد میں بند ہونے کے بجائے اپنے علم کو تازہ اور سرسبز رکھنے کے لیے نہ صرف مطالعے کو جاری رکھیں بلکہ رفقاء کے تجرباتِ علمی سے بھی استفادہ کریں۔

فہرستِ مقالات، شعبۂ اُردو

(i) تفصیلِ مقالات، پی ایچ ڈی (ڈگری عطا کردی گئی)

(اشاریے کی ترتیب: مقالہ نگار ''عنوانِ مقالہ''، نگراں مقالہ، سنہ)

۱) ڈاکٹر اے بی اشرف: ''اُردو ڈرامے کا ارتقاء بحوالہ خصوصی مطالعہ حکیم احمد شجاع پاشا'' بحیثیت ڈراما نگار، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ۱۹۸۴ء۔

۲) ڈاکٹر انوار احمد: ''اُردو مختصر افسانہ _ اپنے سیاسی وسماجی تناظر میں''، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ۱۹۸۴ء۔

۳) ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ: ''سیّد عابد علی عابدؔ _ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر سلیم اختر، ۱۹۸۶ء۔

۴) ڈاکٹر روبینہ ترین: ''ملتان کی ادبی وتہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصّہ'' (دسویں صدی ہجری کے بعد اُردو ادب کی تخصیص کے ساتھ)، ڈاکٹر مہر عبدالحق، ۱۹۸۶ء۔

۵) ڈاکٹر نجیب جمال: ''میرزا یگانہ _ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ۱۹۸۹ء۔

۶) ڈاکٹر محمد اسلم حیات: ''علی عباس حسینی، شخصیت اور فن''، ڈاکٹر سلیم اختر، ۱۹۹۰ء۔

۷) ڈاکٹر سیّد جاوید اختر: ''اُردو کی ناول نگار خواتین'' (ترقی پسند تحریک سے ۱۹۸۰ء تک)، ڈاکٹر اسد اریب رڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۹۴ء۔

۸) ڈاکٹر صلاح الدین حیدر: ''فیض احمد فیضؔ، شخصیت اور فن''، ڈاکٹر سلیم اختر رڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۹۴ء۔

۹) ڈاکٹر محمد خان اشرف: ''اُردو تنقید کا رومانوی دبستان''، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۹۴ء۔

۱۰) ڈاکٹر مختار احمد ظفر: ''ملتان کی شعری روایت'' (بحوالہ راجہ عبداللہ نیاز، اسد ملتانی، علامہ طالوت، کشفی ملتانی، کیفی جام پوری، شفقت کاظمی)، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۹۴ء۔

۱۱) ڈاکٹر علی شیر طور: ''اُردو کے طنزیہ ومزاحیہ ادب میں مجیدؔ لاہوری کا مقام''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۹۶ء۔

۱۲) ڈاکٹر نعمت الحق: ''اُردو لسانیات، تاریخ وتنقید کی روشنی میں''، پروفیسر خلیل صدیقی رڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۶ء۔

۱۳) ڈاکٹر شعیب عتیق خان: ''فسادات ۱۹۴۷ء اور اُردو کا افسانوی ادب''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۷ء۔

۱۴) ڈاکٹر اسلم انصاری: ''اُردو شاعری میں المیہ تصورات'' (میرؔ سے فانیؔ تک)، ڈاکٹر طاہر تونسوی ر ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۹۸ء۔

۱۵) ڈاکٹر عبدالغفار کوکب: ''اُردو میں فکاہیہ کالم نگاری _ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۹ء۔
۱۶) ڈاکٹر شریف احمد، عاصی کرنالی: ''اُردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر''، ڈاکٹر وحید قریشی / ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۹۹ء۔
۱۷) ڈاکٹر فاروق عثمان: ''اُردو ناول میں مسلم ثقافت'' (بحوالہ خصوصی عزیز احمد، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، خدیجہ مستور)، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۹۹ء۔
۱۸) ڈاکٹر عصمت جمیل: ''اُردو افسانے میں عورت کا تصور''، ڈاکٹر اسد اریب / ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۹ء۔
۱۹) ڈاکٹر شاہین مفتی: ''جدید اُردو نظم میں وجودیت'' (۱۹۰۳ء _ ۲۰۰۰ء)، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۹۹ء۔
۲۰) ڈاکٹر قاضی عبدالرحمٰن عابد: ''اُردو افسانے میں اساطیری علامات''، ڈاکٹر انوار احمد، ۲۰۰۰ء۔
۲۱) ڈاکٹر محمد ممتاز خان کلیانی: ''نگار کی ادبی روایات و خدمات۔ ایک تجزیہ''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۲۰۰۰ء۔
۲۲) ڈاکٹر عقیلہ بشیر: ''اُردو ناول میں عورت کا تصور'' (۱۹۴۰ء تا ۱۹۹۰ء)، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۱ء۔
۲۳) ڈاکٹر شگفتہ حسین ماہتاب: ''ادبِ لطیف کی ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، ڈاکٹر انوار احمد، ۲۰۰۱ء۔
۲۴) ڈاکٹر طیب منیر: ''چراغ حسن حسرت _ احوال و آثار''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۲۰۰۱ء۔
۲۵) ڈاکٹر سید علم دار حسین بخاری: ''اُردو افسانے کی روایت میں غلام عباس کا مقام''، ڈاکٹر انوار احمد، ۲۰۰۱ء۔
۲۶) ڈاکٹر امتیاز حسین بلوچ: ''ابراہیم جلیس _ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۱ء۔
۲۷) ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز: ''اُردو افسانے کے فروغ میں (ادبی مجلّہ) ساقی کا کردار''، ڈاکٹر انوار احمد، ۲۰۰۲ء۔
۲۸) ڈاکٹر منیبہ خانم: ''اُردو میں قطعہ نگاری''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۲ء۔
۲۹) ڈاکٹر نذیر بیگم: ''اُردو میں عمرانی دبستانِ تنقید۔ ایک محاکمہ''، ڈاکٹر انوار احمد، ۲۰۰۳ء۔
۳۰) ڈاکٹر راشدہ قاضی: ''اُردو افسانوی ادب میں خدیجہ مستور کا مقام''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۳ء۔
۳۱) ڈاکٹر رانا محمد صفدر راد: ''اُردو آپ بیتی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۳ء۔
۳۲) ڈاکٹر سیّد عامر سہیل: ''جدید اُردو شعری تناظر میں مجید امجد کی شاعری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، ڈاکٹر انوار احمد، ۲۰۰۴ء۔
۳۳) ڈاکٹر محمد ساجد خان: ''تدوینِ کلیات میر تقی میر، دیوانِ اوّل تا ششم مع مقدمہ''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۴ء۔
۳۴) خالد محمود سنجرانی: ''اُردو افسانے کے ابنارمل کردار''، ڈاکٹر انوار احمد / ڈاکٹر سلیم اختر، ۲۰۰۴ء۔

(ii) پی ایچ ڈی کے زیرِ تنقیح مقالات

۱) صباحت مشتاق: ''اُردو افسانے کا اسلوبیاتی مطالعہ، ڈاکٹر اے بی اشرف ر ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۷۔اکتوبر، ۱۹۹۶ء۔

۲) شازیہ عنبرین رانا: ''اُردو تحقیق کی روایت میں مولوی عبدالحق کا مقام'' (بطور مرتب و مدوّن)، ڈاکٹر انوار احمد، ۲ر مئی، ۲۰۰۲ء۔

(iii) پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹرڈ اُمیدواروں کی تفصیل

(اشاریے کی ترتیب: مقالہ نگار ''عنوانِ مقالہ''، نگرانِ مقالہ، تاریخ رجسٹریشن)

۱) ندیم اقبال پاشا: ''اُردو لسانیات شناسی میں پروفیسر خلیل صدیقی کا مقام''، ڈاکٹر عبدالروٴف شیخ ر ڈاکٹر نعمت الحق، ۲۸۔جون، ۱۹۹۷ء۔

۲) فرزانہ کوکب: ''عصمت چغتائی۔شخصیت اور فن''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۶۔دسمبر، ۱۹۹۹ء۔

۳) عذرا بتول: ''ملتان میں اُردو کی نثری اصناف کے آغاز و ارتقا کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، ڈاکٹر انوار احمد، ۲۳۔جون، ۲۰۰۰ء۔

۴) محمود الحسن قریشی: ''اُردو ادب و خطابت کی روایت میں سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، ڈاکٹر عبدالروٴف شیخ ر ڈاکٹر محمد امین، ۲۶۔جون، ۲۰۰۰ء۔

۵) بشریٰ ثمینہ: ''اُردو میں شخصیت نگاری۔تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' (سر سیّد کے دور سے ۱۹۸۵ء تک)، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۶۔جون، ۲۰۰۰ء۔

۶) منصور احمد قریشی: ''جوشؔ کی نظم نگاری اور اُردو شاعری پر اس کے اثرات'' (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)، ڈاکٹر فرمان فتح پوری ر ڈاکٹر نعمت الحق، ۱۱۔دسمبر، ۲۰۰۰ء۔

۷) غلام نبی: ''معاصر تخلیقی و فکری رجحانات کے فروغ میں مجلّہ فنون کا کردار''۔اُردو شعر و ادب کے حوالے سے (۱۹۶۳ء۔۲۰۰۰ء)، ڈاکٹر روبینہ ترین ر ڈاکٹر قاضی عابد، یکم مئی، ۲۰۰۱ء۔

۸) ابرار احمد عابی: ''اُردو کی ادبی تحقیق و تنقید کی روایت کے ارتقاء میں مجلّہ فنون کا فکری کردار'' (۱۹۶۳ء تا ۲۰۰۰ء): ڈاکٹر روبینہ ترین ر ڈاکٹر قاضی عابد، یکم مئی، ۲۰۰۱ء۔

۹) محمد اشرف کمال: ''اُردو زبان و ادب کے تہذیبی و فکری رجحانات کے فروغ'' میں ''افکار'' کا کردار، ڈاکٹر قاضی عابد، ۲۰۔جولائی، ۲۰۰۲ء۔

(۱۰ فرح ذبیح: ''تفہیمِ غالب کی روایت میں علی گڑھ کی ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، ڈاکٹر عقیلہ بشیر، ۲رمئی، ۲۰۰۲ء۔

(۱۱ آصف جہانگیر: '' مجلہ سیپ'' کے تخلیقی اور فکری کردار کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، ڈاکٹر ممتاز خان کلیانی، ۱۸۔ جولائی، ۲۰۰۲ء۔

(۱۲ ندیم مرتضٰی جعفری: ''محمد خالد اختر کی ادبی خدمات، تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۸رنومبر، ۲۰۰۲ء۔

(۱۳ غلام اصغر شاہ: '' اُردو تنقید کی روایت میں سیّد وقار عظیم کا مقام'' اصغر ندیم سیّد/ ڈاکٹر انوار احمد، ۵رنومبر، ۲۰۰۲ء۔

(۱۴ ارشد خانم: '' اقبال کے تصوراتِ فنونِ لطیفہ جنوبی ایشیا کے معاشرتی تناظر میں''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۰۔ فروری، ۲۰۰۳ء۔

(۱۵ ریاض حسین: ''شفیق الرحمٰن کی ادبی خدمات''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹رفروری، ۲۰۰۳ء۔

(۱۶ ناصر عباس: '' اُردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، ڈاکٹر انوار احمد، ۲۶رجنوری ۲۰۰۴ء۔

(۱۷ محمد آصف: '' اسلامی اور مغربی تہذیب کی کشمکش۔ فکرِ اقبال کے تناظر میں''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۲رجون، ۲۰۰۴ء۔

(۱۸ رفعت اقبال: '' اُردو ادب میں خردافروزی اور روشن خیالی کی روایت''، ڈاکٹر قاضی عابد، ۲۹رجون، ۲۰۰۴ء۔

(۱۹ زرغونہ کنول: '' اُردو کے آغاز اور ارتقا کے نظریات'' (لسانی جائزہ)، ڈاکٹر نعمت الحق، ۲۳راگست، ۲۰۰۴ء۔

(۲۰ طارق محمود: ''ریاست حیدرآباد دکن میں اُردو تحقیق کی روایت'' (سقوطِ حیدرآباد دکن ۱۹۴۸ء تک)، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۷راگست، ۲۰۰۴ء۔

(iv) تکمیل شدہ تحقیقی مقالات برائے ایم فل

(اِشاریے کی ترتیب: مقالہ نگار "عنوان مقالہ"، نگرانِ مقالہ، سنہ)

۱) بشریٰ خان: "سرسیّد اور اقبال کے عمرانی تصوّرات کا تقابلی مطالعہ"، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۵ء۔

۲) سعد مسعود غنی: "پاکستان میں اُردو ادب کی مختصر تواریخ کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ"، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۵ء۔

۳) زیب النساء: "قدرت اللہ شہاب"، ممتاز مفتی، اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے صوفیانہ رجحانات کا تجزیہ"، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۵ء۔

۴) نذیر بیگم: "مقدّمۂ شعر و شاعری کے انتقاد کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ"، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۹۵ء۔

۵) غلام یٰسین: "اُردو افسانے کی تخلیقی روایت اور نقوش"، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۹۵ء۔

۶) سیف اللہ گورمانی: "پاکستان میں اُردو کا زندانی ادب"، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۹۵ء۔

۷) رضیہ رحمٰن: "لفظیاتِ مجید امجد کا سماجی تناظر"، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۹۵ء۔

۸) ملک احمد بخش: "یونس جاوید اور اصغر ندیم سیّد کے اُردو ٹی وی ڈراموں کا تنقیدی جائزہ"، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۹۵ء۔

۹) مقبول احمد شاعر: "ادبی جریدہ 'صحیفہ' لاہور کی ادبی خدمات"، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۸ء۔

۱۰) بلقیس صابر: "احمد داؤد۔ شخصیت اور فن"، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۹۸ء۔

۱۱) محمد جاوید پتافی: "محمد عبداللہ قریشی بحیثیت محقق"، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۸ء۔

۱۲) تحریم ظفر: "اُردو غزل کی تنقید" (حالؔی سے فراقؔ تک)، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۸ء۔

۱۳) شازیہ عنبرین: "ملتان میں جدید اُردو نظم کا ارتقاء"، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۹۸ء۔

۱۴) کاشف بلوچ: "ژاک دریدا۔ معاصر اُردو تنقید اور ردِ ساختیات"، ڈاکٹر انوار احمد، ۲۰۰۳ء۔

۱۵) سارہ عنبر: "شوکت صدیقی اور چارلس ڈکنز کے افسانوی ادب کا تقابلی مطالعہ"، ڈاکٹر انوار احمد، ۲۰۰۳ء۔

۱۶) ارم اجمل ملک: "اُردو ناٹک مرقعِ مہر انگیز و قباد" مطبوعہ ۱۸۸۹ء اور ۱۸۹۲ء کی تدوین"، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۲۰۰۳ء۔

۱۷) ترنم بتول: "اُردو شعری روایت میں عبداللطیف تپشؔ کا مقام"، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۲۰۰۳ء۔

۱۸) میمونہ ناز: "حیاتِ اقبالؔ، کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ"، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۳ء۔

۱۹) فرزانہ پروین: ''نوطرزِ مرصع (ترتیب وتصحیح متن) از محمد غوث زرّین''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۳ء۔
۲۰) طارق محمود: ''مجلّہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی ادبی خدمات اور توضیحی اشاریہ'' (جھنڈیر لائبریری، سردار پور میلسی میں موجود فائل کے حوالے سے)، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۳ء۔
۲۱) روبینہ الماس: ''اُردو افسانے میں جلاوطنی کے تجربے کا اظہار''، ڈاکٹر علم دار حسین بخاری، ۲۰۰۳ء۔
۲۲) فرحت افزا: ''حسن بخش گردیزی کے سفرناموں کی تدوین''، ڈاکٹر عقیلہ بشیر، ۲۰۰۳ء۔
۲۳) شاہد نواز: ''سیّد احمد رفیق۔ احوال وآثار''، ڈاکٹر قاضی عابد، ۲۰۰۳ء۔
۲۴) لیاقت علی: ''اُردو کے افسانوی ادب میں اکرام اللہ کا مقام''، ڈاکٹر قاضی عابد، ۲۰۰۳ء۔
۲۵) زرغونہ کنول: ''اُردو شعروادب کے فروغ میں مجلّہ 'سویرا' اور محمد سلیم الرحمٰن کی خدمات''، ڈاکٹر محمد ممتاز خان کلیانی، ۲۰۰۳ء۔

(۷) ایم فل کے زیرِ تحقیق مقالات

۱) محمد ابرار احمد: ''تدوینِ آبِ حیات'' (مقدمہ، حواشی وتعلیقات)، ڈاکٹر انوار احمد، ۲۰۰۴ء۔
۲) : ''جدید اُردو تنقید کے فروغ میں اُردو کے نمائندہ رسائل کا کردار'' (اوراق، صریر، آئندہ، ارتقا، تشکیل)، ڈاکٹر انوار احمد، ۲۰۰۴ء۔
۳) عذرا لیاقت: ''بیسویں صدی کی نمائندہ افسانوی نثر نگار خواتین، ایک تنقیدی جائزہ''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۴ء۔
۴) شہناز پروین: ''فہمیدہ ریاض، کشور ناہید اور پروین شاکر کی شاعری میں عورت کا شعورِ ذات''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۴ء۔
۵) نعمان راشد: ''ملتان میں جدید اُردو تھیٹر کا عمرانی مطالعہ''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۴ء۔
۶) فرحانہ کنول: ''اصطلاحاتِ لسانیات کی توضیحی فرہنگ''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۲۰۰۴ء۔
۷) انجم نورین: ''اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور ممتاز مفتی کے افسانوی ادب میں جہانِ مرد وزن''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۲۰۰۴ء۔
۸) فاخرہ شمیم: ''اُردو ناول کے بیس سال'' (۱۹۸۰ء تا ۲۰۰۰ء)، ڈاکٹر عقیلہ بشیر، ۲۰۰۴ء۔
۹) اقبال احمد شاہ: ''جدید تنقیدی اصطلاحات کی توضیحی فرہنگ''، ڈاکٹر محمد ساجد خان، ۲۰۰۴ء۔
۱۰) عاصمہ کوثر: ''تدوینِ کلیاتِ کشفی ملتانی''، ڈاکٹر قاضی عابد، ۲۰۰۴ء۔

۱۱) رانی صابر: ''اُردو کی نمائندہ داستانوں میں تانیثیت کے عناصر'' (باغ و بہار، فسانہ عجائب، آرائشِ محفل)، ڈاکٹر ممتاز خان کلیانی، ۲۰۰۴ء۔
۱۲) فرح عزیز خان: ''اقبال شناسی کی روایت میں ڈاکٹر جاوید اقبال کا مقام''، ڈاکٹر ممتاز خان کلیانی، ۲۰۰۴ء۔

(vi) ایم۔اے کی سطح کے تحقیقی مقالات

۱) ثمینہ شاہین: ''ن۔م۔راشد۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۷۷ء۔
۲) نسیم اختر: ''مجید امجد۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۷۷ء۔
۳) محمودہ رفعت الماس: ''امتیاز علی تاج بحیثیت ڈراما نگار۔ تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۷۷ء۔
۴) خالد محمود خواجہ: ''شورش کاشمیری۔ ادیب و شاعر''، سیّد افتخار حسین شاہ، ۱۹۷۷ء۔
۵) نگہت رشید: ''مولوی نذیر احمد کے نسوانی کردار''، ڈاکٹر ایس ایم منہاج الدین، ۱۹۷۷ء۔
۶) ارشد خانم: ''عندلیب شادانی، تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، ڈاکٹر عبدالرزاق، ۱۹۷۷ء۔
۷) پروین اختر: ''اُردو کے تین انعام یافتہ ناول'' (اُداس نسلیں، آنگن، خدا کی بستی)، ڈاکٹر ایس ایم منہاج الدین، ۱۹۷۷ء۔
۸) محمد یٰسین شاہد: ''اُردو کے خالق صوفیاء''، ڈاکٹر ایس ایم منہاج الدین، ۱۹۷۸ء۔
۹) شعیب عتیق خان: ''فسادات ۱۹۴۷ء اور اُردو افسانہ''، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۷۸ء۔
۱۰) نجمہ پروین: ''اُردو غزل۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۵ء تک''، قیصرہ خانم، ۱۹۷۸ء۔
۱۱) محمد انور ضیاء: ''ترقی پسند تحریک اور اُردو شاعری''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۷۸ء۔
۱۲) فرزانہ گل: ''پریم چند بحیثیت افسانہ نگار''، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۷۸ء۔
۱۳) احمد فاروق مشہدی: ''ناصر کاظمی۔ شخصیت اور فن''، قیصرہ خانم، ۱۹۷۸ء۔
۱۴) راؤ محمد تسنیم خان: ''کرشن چندر کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر ایس ایم منہاج الدین، ۱۹۷۸ء۔
۱۵) مسرت حفیظ: ''پیرویِ میر''، ڈاکٹر نجیب جمال''، ۱۹۷۸ء۔
۱۶) مبینہ اختر: ''علی پور کا ایلی۔ فکری و فنی مطالعہ''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۷۸ء۔
۱۷) جاوید محمود سہو: ''رفیق خاور جسکانی۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۷۸ء۔
۱۸) ملک مقصود احمد: ''ملتان کے کتب خانے''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۷۸ء۔
۱۹) نگینہ گل: ''آگ کا دریا۔ فکری و فنی مطالعہ''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۷۸ء۔

۲۰) عبدالباقی: ''اسدؔ ملتانی۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر ایس ایم منہاج الدین، ۱۹۷۸ء۔
۲۱) سید علم دار حسین بخاری: ''سعادت حسن منٹو۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۷۸ء۔
۲۲) شگفتہ حسین: ''ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۷۸ء۔
۲۳) نغمہ فراز: ''ممتاز شیریں۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۷۹ء۔
۲۴) روبینہ ترین: ''ترجمہ "Appreciation of Poetry" ''تحسینِ شعر''، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۷۹ء۔
۲۵) شائستہ جمال: ''غلام عباس بحیثیت افسانہ نگار''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۷۹ء۔
۲۶) سعیدہ پروین: ''شکیبؔ جلالی۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۷۹ء۔
۲۷) شہناز بیگم: ''خونِ جگر ہونے تک کا تجزیہ''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۷۹ء۔
۲۸) تنویر بتول: ''سیّد سجاد حیدر یلدرم کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۷۹ء۔
۲۹) عارفہ بخاری: ''انوار انجم۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۷۹ء۔
۳۰) عصمت جمیل: ''عصمت چغتائی بحیثیت ناول نگار''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۷۹ء۔
۳۱) فاخرہ بتول: ''ملتان کے افسانہ نگار۔ تجزیاتی مطالعہ''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۷۹ء۔
۳۲) سلیم اللہ حیدرانی: ''حسن عسکری کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۰ء۔
۳۳) خورشید احمد شکوری: ''کیفی جام پوری۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۸۰ء۔
۳۴) شبانہ چوہان: ''ابنِ انشا کی نثر نگاری''، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۸۰ء۔
۳۵) سائرہ بانو: ''انتظار حسین کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۸۰ء۔
۳۶) رضوانہ یعقوب: ''قدرت اللہ شہاب۔ حیات اور فن''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۰ء۔
۳۷) نجم النساء: ''راشد الخیری کے افسانے''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۰ء۔
۳۸) ملک ثقلین احمد: ''عزیز احمد کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۸۲ء۔
۳۹) رضوان امیر شاہ: ''طاہر غنی۔ سوانح اور فن''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۲ء۔
۴۰) روبینہ تنویر: ''جہانِ دانش۔ ایک تجزیاتی مطالعہ''، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۸۲ء۔
۴۱) غزالہ پروین: ''احمد علی بحیثیت افسانہ نگار''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۲ء۔
۴۲) نسیم زہرا: ''سیّد عبداللہ بحیثیت نقاد''، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۸۲ء۔
۴۳) خالدہ وحید: ''احمد ندیم قاسمی بحیثیت افسانہ نگار''، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۸۲ء۔

۴۴) ساجدہ شاہین: ''رشید امجد کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۲ء۔

۴۵) محمد زمان زاہد: ''ترجمہ "A Greek View of Poetry & Drama with Introduction and Explanation" by Hamilton Fyfe"، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۸۴ء۔

۴۶) غزالہ شاہین: ''بانو قدسیہ بحیثیت ناول نگار''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۸۴ء۔

۴۷) فوزیہ محمود علی: ''قرۃ العین حیدر کے افسانے''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۴ء۔

۴۸) صفیہ بیگم: ''میرزا ادیب۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۴ء۔

۴۹) محمد اصغر شیخ: ''مشتاق احمد یوسفی بحیثیت مزاح نگار''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۸۴ء۔

۵۰) عبدالمالک شاکر: ''ترجمہ "Analysis and Criticism","The Role of Psycho"، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۸۴ء۔

۵۱) بشریٰ ثمینہ: ''ترجمہ "The Short Story" by Reid Ian"، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۸۴ء۔

۵۲) شوذب کاظمی: ''عرش صدیقی۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۴ء۔

۵۳) انیس فاطمہ: ''شفقت کاظمی۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۸۴ء۔

۵۴) ریاض حسین: ''کشفی ملتانی۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۴ء۔

۵۵) سیّد شفقت جبار بخاری: ''منیر نیازی۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۸۴ء۔

۵۶) عذرا بتول: ''پاکستان میں اُردو مرثیہ''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۸۴ء۔

۵۷) نعمت الحق: ''ملتان کے دو محقق'' (مرزا ابن حنیف، علامہ عتیق فکری)، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۸۵ء۔

۵۸) روبینہ رفیق: ''اُردو کے یک بابی ڈرامے''، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۸۵ء۔

۵۹) رشیدہ پروین: ''علامتی افسانہ''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۵ء۔

۶۰) محمد اسلم: ''اُردو کا فکاہی ادب''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۸۵ء۔

۶۱) رابعہ رسول: ''اُردو میں حمدیہ شاعری''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۸۵ء۔

۶۲) ساجد مسعود: ترجمہ "Anatomy of Criticism" کے دو ابواب، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۸۵ء۔

۶۳) طالب حسین: ''اُردو اخبارات کے ادبی ایڈیشن''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۸۵ء۔

۶۴) محمد حسین: ''ملتان میں اُردو صحافت''، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ۱۹۸۵ء۔

۶۵) ممتاز حسین: ''ملتان کے ادبی ادارے''، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ۱۹۸۵ء۔
۶۶) رب نواز مونس: ''جمیل الدین عالی کی شاعری''، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ۱۹۸۶ء۔
۶۷) ملک احمد بخش: ''اُردو سفر نامے ۱۹۴۷ء کے بعد'' (محمود نظامی، مستنصر حسین تارڑ اور بیگم اختر ریاض الدین) ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۶ء۔
۶۸) محمد صفدر: ''ملتان میں اُردو نثر کا ارتقاء'' (قیامِ پاکستان کے بعد کتابوں کے حوالے سے)، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۸۶ء۔
۶۹) نیر سلطانہ: ''اُردو داستانوں پر تنقیدی کام کا جائزہ''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۸۶ء۔
۷۰) نشاط امیر: ''احمد ندیم قاسمی کی شاعری''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۸۶ء۔
۷۱) آفتاب حسین: ''عارف عبدالمتین۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ۱۹۸۶ء۔
۷۲) غلام نبی: ''شوکت صدیقی کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۶ء۔
۷۳) امتیاز حسین بلوچ: ''ملتان کے دو بزرگ شاعر'' (حسن رضا گردیزی اور ارشد ملتانی)، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۸۶ء۔
۷۴) نکہت جبیں: ''ترجمہ "History of Urdu Literature" by Graham Bally''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۸۶ء۔
۷۵) عقیلہ بشیر: ''ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۸۶ء۔
۷۶) شمیم اختر: ''اُردو کی نمائندہ خواتین افسانہ نگار''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۷ء۔
۷۷) محمد نواز آصف: ''فیض احمد فیض کی غزل''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۷ء۔
۷۸) ثمینہ خاور: ''محمد منشا یاد اور مظہر الاسلام کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۷ء۔
۷۹) گل رُخ خان: ''ضمیر جعفری۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۸۷ء۔
۸۰) محمد جاوید: ''اُردو غزل کے تہذیبی رجحانات''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۸۷ء۔
۸۱) ریاض حسین: ''غالب کے سفر''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۸۷ء۔
۸۲) نعیم بی بی: ''اشفاق احمد کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۸۷ء۔
۸۳) سعد مسعود غنی: ''غالب کی سوانح عمریوں کا تقابلی جائزہ''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۸۷ء۔
۸۴) تسنیم کوثر: ''قتیل شفائی بحیثیت شاعر''، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ۱۹۸۷ء۔
۸۵) صفدر عباس: ''ملتان میں ریڈیو ڈرامے کا ارتقاء''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۸۷ء۔

۸۶) دیبا مرتضیٰ: ''اُردو میں دوہا نگاری''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۸۷ء۔
۸۷) نوزیہ کوکب: ''اُردو کے دو مزاح نگار'' (کرنل محمد خان، صدیق سالک)، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۸۷ء۔
۸۸) نزہت پروین: ''امجد اسلام امجد بحیثیت شاعر''، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ۱۹۸۷ء۔
۸۹) ثمر بتول: ''اُردو میں خاکہ نگاری''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۸۷ء۔
۹۰) عشرت شاہین: ''انور سجاد کے ناول''، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۸۷ء۔
۹۱) سعیدہ بانو: ''اُردو کے دو نفسیاتی نقاد''، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۸۷ء۔
۹۲) محمد ابرار احمد: ''حجاب امتیاز علی کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۸ء۔
۹۳) محمد افضل شیخ: ''کشور ناہید۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۸ء۔
۹۴) صلاح الدین: ''ملتان کے تین جواں مرگ شاعر'' (انوار انجم، مقبول انیس اور طارق جامی)، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۸۸ء۔
۹۵) منصور حسن ہاشمی: ''اُردو کی دو آپ بیتیاں'' (گردِ راہ، کھوئے ہوؤں کی جستجو)، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۸ء۔
۹۶) روبینہ کنول: ''صادق حسین کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۸ء۔
۹۷) شاہدہ انجم نیاز: ''ڈاکٹر وزیر آغا۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۸۸ء۔
۹۸) اُم کلثوم: ''ڈاکٹر مہر عبدالحق۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۸۸ء۔
۹۹) محمد انور نذیر علوی: ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری بحیثیت نقاد''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۸۸ء۔
۱۰۰) سیما صدیقی: ''خلیل صدیقی۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۸۸ء۔
۱۰۱) طاہرہ سلیمی: ''عاصی کرنالی۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۸۸ء۔
۱۰۲) فوزیہ ترنم: ''جاں نثار اختر کی شاعری''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۸۸ء۔
۱۰۳) ثمینہ رفعت: ''ترجمہ "Poetic Image" by Levis''، ڈاکٹر اے بی اشرف، ۱۹۸۸ء۔
۱۰۴) فقیر حسین آذر: ''غلام الثقلین نقوی۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۸۸ء۔
۱۰۵) محمد عمر متقی: ''دورِ جدید کے دو نقاد اور محقق: ملک حسن اختر، انور سدید''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۸۸ء۔
۱۰۶) شمع نورین: ''آغا بابر کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۸۸ء۔
۱۰۷) محمد ممتاز ملک: ''شیر افضل جعفری، شخصیت اور فن''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۸۸ء۔
۱۰۸) نزہت بانو: ''کلامِ فیض۔ فرہنگ و اشاریہ''، محمد ساجد خان، ۱۹۸۹ء۔
۱۰۹) فرحانہ منظور: ''کلامِ مجید امجد۔ فرہنگ و اشاریہ''، محمد ساجد خان، ۱۹۸۹ء۔

۱۱۰) محمد ممتاز خان: ''قرۃ العین حیدر کی جانب سے ''اُداس نسلیں'' پر سرقے کا الزام۔ ایک تحقیقی جائزہ''، سیّد علم دار حسین بخاری، ۱۹۸۹ء۔

۱۱۱) ندیم اقبال پاشا: ''ترجمہ "What is Linguistics" by David Cristal''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۸۹ء۔

۱۱۲) عشرت سلطانہ: ''ترجمہ "The Use of Poetry & Use of Criticism by T.S.Eliot"''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۸۹ء۔

۱۱۳) کشور سلطانہ: ''ترجمہ "Linguistic Survery of India" by Garrirson''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۸۹ء۔

۱۱۴) رخشندہ قمر: ''اُردو میں سوانحی ناول''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۸۹ء۔

۱۱۵) فریحہ غزل: ''پروین شاکر کی شاعری''، علم دار حسین بخاری، ۱۹۸۹ء۔

۱۱۶) محمد جاوید: ''اسلم انصاری۔ شخصیت اور فن''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۸۹ء۔

۱۱۷) رضیہ رحمٰن: ''اُردو غزل کی علامات اور ان کی سیاسی سماجی اور تہذیبی معنویت''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۹۰ء۔

۱۱۸) فرح ذبیح: ''اُردو غزل کے کردار سماجی تناظر میں''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۹۰ء۔

۱۱۹) شازیہ کرامت: ''لسانی اصطلاحات'' (اُردو میں موجود لسانیاتی کتب کے حوالے سے)، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۰ء۔

۱۲۰) فریدہ سیال: ''شعبۂ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے تحقیقی مقالات کا توضیحی اشاریہ''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۰ء۔

۱۲۱) روبینہ تبسم: ''دیوانِ غالب کی موضوعاتی تدوین اور سنہ تخلیق کی نشان دہی مع فرہنگ'' (منتخب موضوعات)، محمد ساجد خان، ۱۹۹۰ء۔

۱۲۲) فریدہ یاسمین: ''اشاریہ تراکیب، غزلیاتِ میر و فرہنگ'' (دو دیوان پہلا، تیسرا)، محمد ساجد خان، ۱۹۹۰ء۔

۱۲۳) رخسانہ جبیں: ''اشاریہ تراکیب غزلیاتِ میر و فرہنگ'' (دو دیوان دوسرا، چوتھا)، محمد ساجد خان، ۱۹۹۰ء۔

۱۲۴) رضیہ سلطانہ: ''ملتان میں اُردو مرثیے کی روایت''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۹۰ء۔

۱۲۵) مبینہ عصیم: ''کتب خانہ عصیم کے اخبارات و جرائد کی وضاحتی فہرست''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۹۰ء۔

۱۲۶) مسرت انیس: ''ترجمہ "The Aesthatic Mareuse Dimenation" by Herber''، علم دار حسین بخاری، ۱۹۹۰ء۔

۱۲۷) نبیلہ عصمت: ''منٹو اور غلام عباس کے فنی وسائل کا تقابل'' (ایک تجزیاتی مطالعہ)، علم دار حسین بخاری، ۱۹۹۰ء۔

۱۲۸) راشدہ قاضی: ''سقوطِ مشرقی پاکستان اور اُردو ناول''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۹۰ء۔

۱۲۹) زیب النساء: ''ترجمہ "Tragedy" by Lucus''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۹۰ء۔

۱۳۰) کوثر حسین شاہ: ''پاکستان میں اقبالؔ کی سوانح عمریوں کا تجزیاتی مطالعہ''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۱ء۔

۱۳۱) آصفہ نسیم: ''تحریکِ پاکستان اور اُردو غزل''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۱ء۔

۱۳۲) ثمینہ نسیم: ''ملتان میں اقبالؔ شناسی کی روایت''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۹۱ء۔

۱۳۳) بشریٰ خان: ''مسدسِ حالیؔ کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۹۱ء۔

۱۳۴) یاسمین اشرف: ''اُردو افسانے میں ڈاکٹر سلیم اختر کا مقام''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۹۱ء۔

۱۳۵) عابدہ نسرین: ''انتظار حسین کے ناولوں میں ہجرت کا تجربہ''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۹۱ء۔

۱۳۶) قاضی عبدالرحمٰن عابد: ''شعبۂ اُردو جامعہ زکریا کے زیرِ اہتمام شعرائے ملتان سے متعلق لکھے جانے والے تحقیقی مقالات کی تلخیص و تدوین'' (اسد ملتانی، کشفی ملتانی، کیفی جام پوری، شفقت کاظمی، رفیق خاور جسکانی)، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۹۱ء۔

۱۳۷) محمد ارشد: ''اُردو کی نمائندہ آپ بیتیوں میں خرقِ عادات کا تجزیاتی مطالعہ''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۹۱ء۔

۱۳۸) محمد سردار: ''ملتان کے بزرگ ادیبوں کے تصوراتِ حیات و فن''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۹۱ء۔

۱۳۹) محمد سعید: ''ملتان شہر اور ادب کے قارئین۔ ایک تجزیاتی رپورٹ''، سیّد علم دار حسین بخاری، ۱۹۹۱ء۔

۱۴۰) فرح محمود: ''جدید اُردو ڈرامے میں اشفاق احمد کا مقام''، سیّد علم دار حسین بخاری، ۱۹۹۱ء۔

۱۴۱) زلیخا صبا: ''اُردو کی تین سفرنامہ نگار خواتین'' (پروین عاطف، بشریٰ رحمٰن، نوشابہ نرگس)، سیّد علم دار حسین بخاری، ۱۹۹۱ء۔

۱۴۲) سمیعہ مقبول: ''کلیاتِ میرؔ کا موضوعاتی انتخاب''، محمد ساجد خان، ۱۹۹۱ء۔

۱۴۳) زاہدہ بشیر: ''اُردو کی تین سفرنامہ نگار خواتین'' (سائرہ ہاشمی، سلمیٰ اعوان، نجمہ افتخار)، محمد ساجد خان، ۱۹۹۱ء۔

۱۴۴) خدیجہ اشرف: ''اسد محمد خان بحیثیت افسانہ نگار''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۹۲ء۔

۱۴۵) رقیہ فیض رسول: ''سیّد محسن نقوی، شخصیت اور شاعری''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۲ء۔

۱۴۶) شمیم جمال: ''حیدر گردیزی۔ شخصیت اور شاعری''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۹۲ء۔

۱۴۷) کاشف شہزاد: ''شفیق الرحمٰن کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۹۲ء۔

۱۴۸) زکیہ سرور: ''ملتان میں اُردو انشائیہ''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۹۲ء۔
۱۴۹) محمد احمد خان: ''اُردو اکادمی کی علمی و ادبی خدمات''، محمد ساجد خان، ۱۹۹۲ء۔
۱۵۰) ریاض حسین راہی: ''ڈاکٹر خیال امروہوی۔ شخصیت اور شاعری''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۲ء۔
۱۵۱) طارق رشید: ''آب گم'' کا تنقیدی جائزہ، سیّد علم دار حسین بخاری، ۱۹۹۲ء۔
۱۵۲) فرزانہ کوکب: ''الکھ نگری'' کا تجزیاتی مطالعہ''، ڈاکٹر انوار احمد، ۱۹۹۳ء۔
۱۵۳) تحریم ظفر: ''اختر حسین جعفری کی شاعری''، سیّد علم دار حسین بخاری، ۱۹۹۳ء۔
۱۵۴) لبنیٰ رانی: ترجمہ ''تنقیدی ادب کے اُصول'' (حصہ اوّل)، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۹۳ء۔
۱۵۵) صائمہ شمس: ترجمہ ''تنقیدی ادب کے اُصول'' (حصہ دوم)، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۹۳ء۔
۱۵۶) محمد جمشید رضوانی: ''جگن ناتھ آزاد بحیثیت شاعر''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۳ء۔
۱۵۷) حمیرا کیانی: ''غالبؔ کا تنقیدی شعور خطوط کے آئینے میں''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۹۳ء۔
۱۵۸) شفیع الدین: ''ممتاز حسین بطور نقاد''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۹۳ء۔
۱۵۹) فریحہ خان: ''غالبؔ کی فارسی اور اُردو غزلیات کے مشترکہ موضوعات کا تقابلی جائزہ''، محمد ساجد خان، ۱۹۹۳ء۔
۱۶۰) نائلہ مجوکہ: ''ترجمہ "A Treatise on the Novel"، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۴ء۔
۱۶۱) فوزیہ رانی: ''اُردو افسانے میں علامتی کردار'' (۱۹۸۰ء تا ۱۹۹۰ء)، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۹۴ء۔
۱۶۲) کاشف عباس بلوچ: ''جدید اُردو افسانہ اور نفسیاتی شعور''، محمد ساجد خان، ۱۹۹۴ء۔
۱۶۳) تسنیم رحمٰن: ''جدید اُردو غزل میں تمثال آفرینی'' (۱۹۸۰ء تا ۱۹۹۰ء)، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۹۴ء۔
۱۶۴) سیّد محمد مبشر رضا نقوی: ''سجاد باقر رضوی بطور شاعر''، ڈاکٹر نجیب جمال، ۱۹۹۴ء۔
۱۶۵) نبیلہ ذاکر: ''ملتان کے تین شاعر'' (صادق مصوّر، ریاض انورؔ، وفا حجازی)، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۹۴ء۔
۱۶۶) نکہت جمال: ''سیّد قاسم محمود کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۹۴ء۔
۱۶۷) طاہر نور: ''قرۃ العین حیدر کے تین ناولوں'' (آخرِ شب کے ہم سفر، گردشِ رنگِ چمن اور چاندنی بیگم) کا تجزیاتی مطالعہ، عقیلہ جاوید، ۱۹۹۴ء۔
۱۶۸) حمیرا نور: ''اُردو ناول نگاری میں عبداللہ حسین کا مقام''، عقیلہ جاوید، ۱۹۹۴ء۔
۱۶۹) سمیرا بتول ہاشمی: ''صادق نعمت کے منتخب کلام کی تدوین''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۴ء۔
۱۷۰) افشاں بتول: ''ملتان میں اُردو تحقیق و تنقید کی روایت''، سیّد علم دار حسین بخاری، ۱۹۹۴ء۔
۱۷۱) نسیم اختر: ''اُردو لسانیات میں خلیل صدیقی کا مقام''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۵ء۔

۱۷۲) حمیرا بلوچ: ''طارق محمود کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر عبدالرؤف شی، ۱۹۹۵ء۔

۱۷۳) کاشف مجید: ''خلیل رام پوری۔ شخصیت وفن''، عقیلہ جاوید، ۱۹۹۶ء۔

۱۷۴) نگہت زہرا: ''ڈاکٹر اے بی اشرف کی تنقید نگاری''، قاضی عابد، ۱۹۹۶ء۔

۱۷۵) یاسمین حبیب: ''میر تقی میر کا تصوّرِ شعر''، محمد ساجد خان، ۱۹۹۶ء۔

۱۷۶) محمد آصف قریشی: ''حزیں صدیقی'' انتخاب وتدوینِ کلام، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۹۶ء۔

۱۷۷) لیاقت علی: ''افتخار عارف کی شاعری کا فنی وفکری تجزیہ''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۹۷ء۔

۱۷۸) حمیرا قدیر خان: ''ٹی وی ڈراما غالبؔ'' کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۷ء۔

۱۷۹) آصف بلوچ: ''امراؤ طارق۔ شخصیت اورفن''، عقیلہ جاوید، ۱۹۹۷ء۔

۱۸۰) میمونہ سعید جتوئی: ''مظہر الاسلام کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۱۹۹۷ء۔

۱۸۱) رانی آکاش ہاشمی: ''سلیم کوثر کی غزل کا فکری وفنی جائزہ''، قاضی عابد، ۱۹۹۷ء۔

۱۸۲) ثمینہ اصغر: ''رشید امجد کے افسانوں کا تکنیکی مطالعہ''، سیّد علم دار حسین بخاری، ۱۹۹۸ء۔

۱۸۳) محمد اکرام الحق: ''فرہنگِ کلیاتِ راشدؔ''، عقیلہ جاوید، ۱۹۹۸ء۔

۱۸۴) سیّدہ آصفہ زہرا: ''اشرف صبوحی کی نثر نگاری''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۱۹۹۸ء۔

۱۸۵) شازیہ بٹ: ترجمہ "The Theory of Novel"، قاضی عابد، ۱۹۹۸ء۔

۱۸۶) نفیس اختر: ''مرزا حامد بیگ کی افسانہ نگاری''، سیّد علم دار حسین بخاری، ۱۹۹۸ء۔

۱۸۷) فصیحہ بانو: ''راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں نسوانی کردار''، محمد ساجد خان، ۱۹۹۸ء۔

۱۸۸) خورشید احمد تہیم: ''جابر علی سیّد۔ شخصیت اورفن''، قاضی عابد، ۱۹۹۸ء۔

۱۸۹) شاہد نواز: ''سیّد عبداللہ کی تنقیدِ میر کا تنقیدی جائزہ''، محمد ساجد خان، ۱۹۹۹ء۔

۱۹۰) رحمت علی شاد: ''شہزاد منظر کی تنقید نگاری''، سیّد علم دار حسین بخاری، ۱۹۹۹ء۔

۱۹۱) نوشین خورشید: ''قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں عورت کا تصوّر''، عقیلہ جاوید/محمد ساجد خان، ۱۹۹۹ء۔

۱۹۲) صائمہ یوسف: ''اُردو افسانے پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی تنقید''، قاضی عابد، ۱۹۹۹ء۔

۱۹۳) راحیلہ یوسف: ''قرۃ العین حیدر کے سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ''، سیّد علم دار حسین بخاری، ۱۹۹۹ء۔

۱۹۴) احسنہ بتول: ''ظہیر بابر کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر روبینہ ترین/قاضی عابد، ۱۹۹۹ء۔

۱۹۵) گلینہ شبنم: ''باغ وبہار'' اور ''نوطرزِ مُرصّع'' (تحسین) کا تقابلی مطالعہ، ڈاکٹر انوار احمد، ۲۰۰۰ء۔

۱۹۶) سمیرا پروین: ''باغ وبہار اور نوطرزِ مُرصّع'' (زریں) کا تقابلی مطالعہ، ڈاکٹر انوار احمد، ۲۰۰۰ء۔

۱۹۷) قاضی عطاء الرحمٰن: ''جدید اُردو غزل کی روایت میں ظفر اقبال کے شعری تجربات''، سیّد علم دار حسین بخاری، ۲۰۰۰ء۔

۱۹۸) راضیہ بتول جعفری: ''پروین شاکر کی شاعری اپنے سیاسی وسماجی تناظر میں''، محمد ساجد خان، ۲۰۰۰ء۔

۱۹۹) عاصمہ کوثر: ''شوکت واسطی۔احوال وآثار''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۰ء۔

۲۰۰) پروین خان: ''سیّد مقصود زاہدی۔احوال وآثار''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۰ء۔

۲۰۱) شازیہ عظمت: ''اُردو افسانے کی روایت میں اشفاق احمد کا مقام''، عقیلہ جاوید، ۲۰۰۰ء۔

۲۰۲) شفقت عباس: ''پریم چند کے افسانوں میں داستانوی اثرات''، قاضی عابد، ۲۰۰۰ء۔

۲۰۳) نادیہ فریال: ''اُردو کی دو آپ بیتیوں''، ''بری عورت کی کتھا (کشور ناہید) اور ''ہم سفر'' (حمیدہ اختر رائے پوری) کا تجزیاتی مطالعہ''، قاضی عابد، ۲۰۰۰ء۔

۲۰۴) شہناز پروین: ''غلام محمد کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر انوار احمد، ۲۰۰۱ء۔

۲۰۵) کوثر پروین: ''اُردو میں انگریزی سے مستعار الفاظ'' (الف مقصورہ: اصل سے تلفظ اور معنوں میں انحراف)، ڈاکٹر نعمت الحق، ۲۰۰۱ء۔

۲۰۶) راشدہ ملک: ''اُردو میں انگریز سے مستعار الفاظ'' (تلفظ اور معنوی انحراف)، ڈاکٹر نعمت الحق، ۲۰۰۱ء۔

۲۰۷) نازیہ خالد: ''ترجمہ انگریزی کتاب "Practical Criticism" (صفحہ ۲۲۱ تا ۲۴۰)، ڈاکٹر ممتاز خان کلیانی، ۲۰۰۱ء۔

۲۰۸) فریحہ رحمان: ''ترجمہ انگریزی کتاب "Practical Criticism" (صفحہ ۱ تا ۱۲۰)، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۱ء۔

۲۰۹) کاشفہ چوہدری: ''مرزا محمد رشید۔احوال وآثار''، ڈاکٹر انور احمد، ۲۰۰۲ء۔

۲۱۰) میمونہ سبحانی: ''اُردو کے افسانوی ادب میں فرخندہ لودھی کا مقام''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۲ء۔

۲۱۱) صائمہ نازلی: ''فتح محمد ملک کی علمی وادبی خدمات''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۲ء۔

۲۱۲) زربخت عمر: ''اُردو میں عورتوں کے مقبول عام افسانے اور تانیثیت''، ڈاکٹر انوار احمد، ۲۰۰۲ء۔

۲۱۳) میمونہ رب نواز: ''خلیل صدیقی ریسرچ لائبریری کے رسائل میں تحقیقی وتنقیدی مضامین'' (توضیحی اشاریہ)، ڈاکٹر عقیلہ جاوید، ۲۰۰۲ء۔

۲۱۴) حمیرا اشفاق: ''اُردو فکشن کے جدید رویوں اور رجحانات کے فروغ میں 'آج' (کراچی) کا کردار''، ڈاکٹر قاضی عابد، ۲۰۰۲ء۔

۲۱۵) حنا کنول: ''اُردو کی شعری روایت میں رحمان فراز اور ڈاکٹر محمد امین کا مقام''، ڈاکٹر محمد ممتاز خان کلیانی، ۲۰۰۲ء۔
۲۱۶) شہلا کنول: ''خواجہ معین الدین کے نمائندہ ڈراموں کی ترتیب و تدوین مع مقدمہ''، ڈاکٹر انوار احمد، ۲۰۰۳ء۔
۲۱۷) صائمہ رانی: ''اُردو تحقیق و تنقید میں ڈاکٹر معین الدین عقیل کا مقام''، ڈاکٹر انوار احمد، ۲۰۰۳ء۔
۲۱۸) ثوبیہ کنول: ''عورت کے بارے میں علامہ اقبال کے تصورات کا تنقیدی محاکمہ'' (پاکستانی معاشرتی تناظر میں)، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۳ء۔
۲۲۰) سعدیہ افضال: ''اُردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ چندراوتی ماہ لقا۔ سوانح و فن''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۳ء۔
۲۲۱) محمد عمران: ''پروفیسر لطیف عارف کی ادبی خدمات۔ ایک محاکمہ''، ڈاکٹر روبینہ ترین، ۲۰۰۳ء۔
۲۲۲) صائمہ صالح: ''علی گڑھ میں اقبال شناسی کی روایت۔ خصوصی مطالعہ رشید احمد صدیقی، اُسلوب احمد انصاری''، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۲۰۰۳ء۔
۲۲۳) اعجاز الدین: ترجمہ انگریزی کتاب: Marxism and Literary Criticism by Tervy Eagleton، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، ۲۰۰۳ء۔
۲۲۴) محمد رمضان: ''ترتیب و تدوین، کلیاتِ نثرِ سجاد حیدر یلدرم، مع مقدمہ''، ڈاکٹر عقیلہ بشیر، ۲۰۰۳ء۔
۲۲۵) اقبال حسین: ''جدید اُردو تنقید کی روایت میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا مقام''، ڈاکٹر قاضی عابد، ۲۰۰۳ء۔
۲۲۶) سمیعہ ولی خان: ''ترتیب و تدوین، کلیاتِ ارشد ملتانی مع مقدمہ''، ڈاکٹر محمد ممتاز خان کلیانی، ۲۰۰۳ء۔

(vii) یونیورسٹی سے ملحقہ پوسٹ گریجویٹ کالجز کی تحقیق

(اشاریے کی ترتیب: مقالہ نگار، عنوانِ مقالہ، نگراں، کالج کا نام)

۱) رضوانہ بشیر: ترجمہ ''ادبی تنقید''، مسز نیلم شعیب، گورنمنٹ گرلز کالج، ساہیوال۔
۲) ناہید سلطانہ: ترجمہ ''لایعنیت''، مسز نیلم شعیب، گورنمنٹ گرلز کالج، ساہیوال۔
۳) زوار حسین بھٹا: ''ڈیرہ غازی خان میں اُردو شاعری''، ممتاز احمد خان، گورنمنٹ کالج، ڈیرہ غازی خان۔
۴) مجاہد حسین خٹک: ''اقبال اور افلاطون، ''اشتراک و اختلاف''، شریف اشرف، گورنمنٹ کالج، ڈیرہ غازی خان۔
۵) تبسم شمشاد: ''کالرج کی ادبی سوانح حیات''، ممتاز احمد خان، گورنمنٹ کالج، ڈیرہ غازی خان۔
۶) ناہید فاطمہ: ''تراکیب میر تقی میر و فرہنگ، فیض احمد بلوچ''، گورنمنٹ کالج، ڈیرہ غازی خان۔

۷) تسنیم کوثر: ترجمہ ''انیسویں صدی کا مطالعہ''، ممتاز احمد خان، گورنمنٹ کالج، ڈیرہ غازی خان۔

۸) سیّد پروین: ''صحافتی قطعہ نگاری''، قاسم حسین رضوی، گورنمنٹ کالج، ڈیرہ غازی خان۔

۹) کرامت علی کاظمی: ''لیّہ کا ادبی منظر نامہ''، انوار الحکیم عثمانی، گورنمنٹ کالج، ڈیرہ غازی خان۔

۱۰) عارفہ جبیں: ''ساہیوال کا ادبی منظر نامہ، طاہرہ جبیں''، گورنمنٹ گرلز کالج، ڈیرہ غازی خان۔

۱۱) محمد اجمل: ''خواجہ معین الدین کا ڈراما نگاری میں مقام''، فرحت رضوی، گورنمنٹ کالج، ڈیرہ غازی خان۔

۱۲) ممتاز حسین شاہ: ''تراکیب و فرہنگ، کلیاتِ حسرتؔ''، انوار الحکیم عثمانی، گورنمنٹ کالج، ڈیرہ غازی خان۔

۱۳) سعید احمد: ''اشاریہ تراکیب و فرہنگ، غزلیاتِ مومنؔ''، انوار الحکیم عثمانی، گورنمنٹ کالج، ڈیرہ غازی خان۔

۱۴) احمد بخش احمدانی: ''اشاریہ تراکیب و فرہنگ غزلیاتِ آتشؔ''، آفتاب حسین سرائی، گورنمنٹ کالج، ڈیرہ غازی خان۔

۱۵) زرغونہ کنول: ''فیاض تحسین۔ شخصیت و شاعری''، انوار الحکیم عثمانی، گورنمنٹ کالج، ڈیرہ غازی خان۔

۱۶) شمیم اختر: ''ملتان میں اُردو غزل۔ موضوعات و اسالیب'' (۱۹۷۵ء تا ۱۹۹۵ء) محمد خان کھوسہ، گورنمنٹ کالج، ڈیرہ غازی خان۔

۱۷) امجد بخاری: ''فکرِ اقبالؔ اور شعرِ اقبالؔ میں مستعمل ادبی اصطلاحات کا توضیحی اشاریہ''، انور جمال، گورنمنٹ کالج سول لائنز، ملتان۔

۱۸) رخسانہ پروین: ''جدید اُردو ناول کی روایت میں ''آگے سمندر ہے'' کا مقام و مرتبہ''، محمود الحسن قریشی، گورنمنٹ کالج سول لائنز، ملتان۔

۱۹) صائمہ پروین: ماہ نامہ ''تخلیق (لاہور) کی ادبی خدمات''، فرمان علی طاہر، گورنمنٹ کالج سول لائنز، ملتان۔

۲۰) آصفہ منظور: ''جدید اُردو نظم کی روایت میں عبدالرشید کا مقام''، انور جمال، گورنمنٹ کالج، سول لائنز، ملتان۔

۲۱) ثمرین انوار: ''جنوبی پنجاب کی شاعرات کی غزل کا تنقیدی مطالعہ''، انور جمال، گورنمنٹ کالج سول لائنز، ملتان۔

۲۲) سیّد شوکت علی بخاری ''اسد ملتانی کے کلام کی تدوین مع مقدمہ''، محمود الحسن قریشی، گورنمنٹ کالج سول لائنز ملتان۔

۲۳) محمد اکرم جاوید: ''ملتان میں اُردو حمد و نعت کا ارتقاء''، فرمان علی طاہر، گورنمنٹ کالج سول لائنز، ملتان۔

۲۴) محمد یاسر: ''گورنمنٹ کالج سول لائنز ملتان کے ادیب و شاعر، شاگرد اور اساتذہ کا تعارفی اشاریہ'' (ابتداء سے ۲۰۰۰ء تک)، پروفیسر انور جمال، گورنمنٹ کالج، سول لائنز، ملتان۔

۲۵) کاشفہ پروین: ''کرسٹوفر کارڈویل کی کتاب "Illusion and Reality" کا اُردو ترجمہ، مسز نیلم شعیب''، گورنمنٹ کالج برائے خواتین، ساہیوال۔

۲۶) قاضی راشد محمود: ''شعرائے لیہ کے فکری رجحانات کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ''، ڈاکٹر ظفر عالم ظفری، گورنمنٹ کالج، لیہ۔

(viii) زیرِ تکمیل مقالات ایم۔اے، ۲۰۰۴ء

۱) شاہدہ رسول: ''رضا علی عابدی۔احوال و آثار''، ڈاکٹر انوار احمد، شعبۂ اُردو۔

۲) رفیعہ اجمل: ''Marxism" by Terry Eagilton"، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، شعبۂ اُردو۔

۳) عمران اظفر: ''تدوینِ کلیاتِ اصغر علی شاہ''، ڈاکٹر روبینہ ترین، شعبۂ اُردو۔

۴) شبانہ نورین: ''فرہنگِ کلیاتِ غزلیاتِ میر تقی میرؔ''، ڈاکٹر محمد ساجد خان، شعبۂ اُردو۔

۵) فریحہ چودھری: ''انوارِ سہیلی کے اُردو تراجم کا تقابلی مطالعہ''، ڈاکٹر ممتاز خان، کلیانی، شعبۂ اُردو۔

۶) نسیم عباس: ''سرسیّد تحریک پر ہونے والی تنقید کا مطالعہ۔ خصوصی حوالہ پروفیسر محمد عمر، ڈاکٹر سیّد عبداللہ: ڈاکٹر ظفر حسن اور ڈاکٹر محمد علی صدیقی''، ڈاکٹر قاضی عابد، شعبۂ اُردو۔

۷) عالیہ رُباب: ''اُردو آپ بیتی نگاروں میں حمیدہ اختر حسین کا مقام''، شازیہ عنبرین رانا، شعبۂ اُردو۔

۸) معظمہ امین: ''زوار حسین کی علمی و ادبی خدمات کا تحقیقی جائزہ''، پروفیسر انور جمال، گورنمنٹ کالج سول لائنز، ملتان۔

۹) شاہدہ منظور: ''کیف انصاری کے کلام کی تدوین مع سوانح و مقدمہ''، محمود الحسن قریشی، گورنمنٹ کالج سول لائنز، ملتان۔

رفتارِ تحقیق

(۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۶ء)

☆ ایم فِل، پی. ایچ. ڈی کے سَند یافتگان

۱۹۹۹ء

ڈاکٹر جمیل اختر (پی. ایچ. ڈی)
مقالہ بعنوان: ''عبدالعزیز فطرت کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین''
نگراں: پروفیسر، ڈاکٹر نسیم آراء سرتاج

۲۰۰۰ء

ڈاکٹر ممتاز صادق (پی. ایچ. ڈی)
مقالہ بعنوان: ''کشمیر میں اُردو نثر کا تحقیقی مطالعہ''
نگراں: پروفیسر، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

۲۰۰۱ء

ظفر حسن ظفرؔ (ایم فِل)
مقالہ بعنوان: ''برِصغیر کے مسلمانوں کا جداگانہ تشخص اور اقبالؔ: ایک تنقیدی مطالعہ''
نگراں: پروفیسر، ڈاکٹر نسیم آراء سرتاج

۲۰۰۲ء

ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال (پی. ایچ. ڈی)
مقالہ بعنوان: ''مکتوباتِ امیرؔ مینائی کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ''
نگراں: پروفیسر، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں۔

۲۰۰۳ء

ڈاکٹر سیّد منوّر ہاشمی (پی. ایچ. ڈی)
مقالہ بعنوان: ''علامہ اقبالؔ کی اُردو شاعری میں فطرت نگاری اور ہم عصر شاعر
حسرتؔ موہانی کی فطرت نگاری کا تقابلی جائزہ''
نگراں: پروفیسر فہمیدہ شیخ

۲۰۰۴ء۔۲۰۰۵ء

اس عرصے میں سندھ یونیورسٹی میں کوئی تحقیقی مقالہ (ایم فل/ پی ایچ ڈی) پیش نہیں کیا گیا البتہ اِس دوران شعبۂ اُردو میں لکھے گئے درج ذیل مقالات شائع ہوئے:

۱۔ ''اُردو میں تاریخ نویسی'' از ڈاکٹر ظفر اقبال (مقالہ برائے پی ایچ ڈی)

۲۔ ''اکرام تبسم احوال و آثار'' از عبدالغفور (مونوگراف)۔

۲۰۰٦ء

عظمیٰ زمان (پی ایچ ڈی)

مقالہ بعنوان: ''شمالی علاقہ جات میں اُردو زبان و اَدب کا آغاز، ارتقاء اور اثرات''

نگراں: پروفیسر ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال

عظمیٰ زمان نے کورس ورک اور چار کامیاب مدافعتی سیمینار کے بعد مقالہ مقررہ وقت میں جمع کرادیا ہے۔

☆ درج ذیل اسکالرز نے پہلے شعبہ جاتی مدافعتی سیمینار میں کامیابی حاصل کرلی ہے۔

پی، ایچ، ڈی اسکالرز

۱۔ عتیق احمد جیلانی:

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی۔

مقالہ بعنوان: ''رسالہ 'معارف' کا اُردو اَدبی سرمایہ: ایک تحقیقی اور تنقیدی جائزہ''

۲۔ رفیق احمد خاں:

لیکچرر، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی۔

مقالہ بعنوان: ''ضیاء الدّین احمد برنی کی علمی و اَدبی خدمات کا تنقیدی جائزہ''

۳۔ مرزا سلیم بیگ:
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی۔
مقالہ بعنوان: ''اُردو کی اَدبی تاریخ نویسی: ایک تحقیقی جائزہ''

ایم فِل اسکالرز

۱۔ شاہ انجم بخاری:
لیکچرر، گورنمنٹ (بوائز) ڈگری کالج، کالی موری، حیدرآباد۔
مقالہ بعنوان: ''جلیل قِدوائی کی تنقیدی خدمات، ایک تحقیقی مطالعہ''

۲۔ نثار احمد:
لیکچرر، گورنمنٹ پاکستان (بوائز) کالج، سعید پور، بدین۔
مقالہ بعنوان: ''فرہنگِ محمد قلی قطب شاہ''

۳۔ دُردانہ جاوید:
لیکچرر، گورنمنٹ ناظرۃ (گرلز) ڈگری کالج، حیدرآباد۔
مقالہ بعنوان: ''پاکستان میں اُردو خاکہ نگاری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ''

۴۔ فاطمہ صبا:
لیکچرر، گورنمنٹ (گرلز) ڈگری کالج، حیدرآباد۔
مقالہ بعنوان: ''اُردو دیباچہ نگاری کے آغاز و ارتقا کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ''
(ابتداء سے ۱۹۰۰ تک)

۵۔ منظور عمرانی:
اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ ڈگری کالج اُستا محمد، کوئٹہ، بلوچستان۔
مقالہ بعنوان: ''بلوچستان کی اُردو شاعری میں بلوچ شعرا کی خدمات کا
تحقیقی و تنقیدی مطالعہ''

۶۔ فرزانہ صدف:
لیکچرر، گورنمنٹ شاہ عبداللطیف (گرلز) ڈگری کالج ،لطیف آباد، حیدرآباد۔
مقالہ بعنوان: ''سید سلطان محمود حسین کی علمی اور اَدبی خدمات کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ''

۷۔ علی انور کاندھڑو:
لیکچرر، گورنمنٹ (بوائز) ڈگری کالج، قاسم آباد، حیدرآباد۔
مقالہ بعنوان: ''اُردو کی ترقی میں پیر سیّد حُسام الدین راشدی کا حصہ ایک تحقیقی جائزہ''

☆ درج ذیل اسکالرز کا پہلا شعبہ جاتی مدافعتی سیمینار 2007 کی پہلی سہ ماہی میں متوقع ہے۔

۱۔ سیّدہ رخسانہ شمس بخاری (ایم فِل)
مقالہ بعنوان: ''مولانا محمد عبدالقدیر صدیقی حسرؔت کی اَدبی خدمات''

۲۔ سید قمر الدین: (پی ایچ ڈی)
اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج سریاب روڈ، کوئٹہ، بلوچستان۔
مقالہ بعنوان: ''سندھ میں غالبؔ شناسی کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ''

۳۔ عبداللطیف انصاری: (ایم فل)
لیکچرر، گورنمنٹ (بوائز) ڈگری کالج، کوٹڑی، جام شورو۔
مقالہ بعنوان: ''اُردو خطبے کے آغاز وارتقا کا تحقیقی مطالعہ'': ابتدا سے عہدِ سرسید تک

۴۔ عبدالسلام عادل: (ایم فل)
لیکچرر، گورنمنٹ سٹی (بوائز) ڈگری کالج، حیدرآباد۔
مقالہ بعنوان: ''ڈاکٹر الیاس عشقی کے اُردو نثری سرمائے کی ترتیب وتدوین''

---

9. **Dr. Mohammad Raziuddin Siddiqui:** "Sindh University. Ilam Ka Aek Naya Bhahwara" is a boon for the readers who are interested in viewing the Educational Development of the University of Sindh. It is written by a very distinguished scholar, an eminent scientist, a great educationist and an Ex. Vice Chancellor of the University Sindh. It is a short but important and delectable article, specially, interesting for those readers who are interested in knowing the background and spread of education in Sindh in early day of Pakistan.

10. **Nisar Ahmed:** "Shoba-e-Urdu Sindh University Kay Tahqiqi Maqalat" brings before us a very important literary work conducted, specially, under the guidance of great research scholar Dr. Ghulam Mustafa Khan who joined as a Head of the Department of Urdu in 1956. The long list of essays, treatises and theses provided by the writer will be very useful specially for future scholars of Urdu, interested in literary research and criticism.

11. **Dr. Rubina Tareen:** "Adbi Tahqiq Ki Riwayat Mein Bahauddin Zakria University Multan Ka Kirdar" highlights significant contribution of Bahauddin Zakria University in the field of literacy research. This University started in 1975 but M.A Urdu classes had already been going on since 1963 under the auspices of the University of Punjab, and the students began writing literary treatises in 1967.

---

5. **Dr. Atash Durrani:** "Tahqiqi Khawas Mein Aitabariyat Ya Sakh" indicates that researcher is "Searching again" through what others have written about the subject. Therefore it is the search for the truth. Modern literacy research uses new and scientific methods to come to the conclusions. It is helped by psychology and other social sciences, and its conclusions are based on sufficient and sound evidence.

6. **Dr. Tanzeem-ul-Firdous:** "Maulana Ahmed Raza Khan Ki Natia Shaeri Mein Hiyat Ke Tanwwo Ki Ibtedai Riwayat" is a beautiful and inspiring article giving the glimps of Natia Shaeri of a great lover of the Holy Prophet of Islam. There are adoring and inspiring verses composed by Moulana Ahmed Raza Khan who has beautifully used Ghazal from for Nats. It is a difficult form of poetry and, therefore, requires a great sincerity, commitment and devotion. It comes from a heart and touches a heart.

7. **Dr. Mohammad Yousaf Khushak** "Aalamgiriat Aur Adab Perhanay Ke Jadeed Rujhanat" is an interesting and thought provoking essay discussing the new methods of teaching literature in the atmosphere of globalization because today the world has become a global village, and globalization is bringing all the countries of the world closer to one another. Man is corning out of geographical boundaries and taking himself as a world citizen. It requires a new approach of teaching literature in this fast changing world, which has been beautifully asserted by the writer.

8. **Ateeq Ahmed Jeelani:** "Nasir Kazmi Ki Ghazloon Ka Ashaeti-o-Tadvimi Goshwara" is an interesting and profting chronological study of Nasir Kazmi's Ghazals, with changes made by the poet in some couplets, which are not included in any of his published works. This is a labour of love. It shows the evolution of thought and artistic approach of the poet in his poetry. These Ghazals were published in different Urdu magazines and they might have remained unknown to the lovers of Nasir Kazmi's Poetry, had not a brilliant writer taken pains to collect and present them in the present form. It is a highly readable and enjoyable article and a boon for the lovers of Nasir Kazmi.

Departmental Research Journal "TAHQIQ", Vol: 14, 2006

Department, of Urdu, University of Sindh, Jamshoro, Pakistan.

A GLIMPSES OF THE ARTICLES

1. **Dr. Mukhtaruddin Ahmed:** "Muntakhibul - Qauwafi Az Ishqui Azeemabady" is an impressive piece of research illustrating, with examples, the efforts of a 19th Century Persian and Urdu poet and his considerable contribution to Persian and Urdu poetry. The writer took pains in bringing before us some of the poet's hitherto unpublished poetry.
2. **Dr. Mukhtaruddin Ahmed:** "Risala-e-Qafia Az Joshish Azeemabady" is also an important research work telling us about Jaswant Rai Nagar's youngest son who embraced Islam and today is known as one of the greatest poets of Azeemabad. There is only one copy of his Risala-e-Qafia preserved in the famous Khuda Bakhsh Library of India.
3. **Allama Akhlaq Hussain Dehlvi:** "Tahqiqi Mazamin Ka Asloob" is an informative, instructive and a very useful essay, specially, for the students engaged in research. It consists of four parts and each part brings before us, in simple and lucid language, some basic and essential rules for conducting research. According to the writer a beginner should start with collecting information, arranging it in order, giving it a proper shape and finally presenting it in a suitable language for the work in hand. The knowledge of past and present helps in the organization of the material. The researcher should have a critical bend of mind and aesthetic sense for judging merits and demerits of the work before pronouncing any judgment, and the style must suit the subject.
4. **Dr. Moinuddin Aqeel:** "Urdu Mein Lisani Tahqiq - Rawayat Aur Masael" is a deep study of some linguistic pattern and changes in the development of Urdu Language. It traces the history of linguistic research in Urdu. The writer also points out how Indian and Pakistani tongues influence one effect on another, and how researches have found and noted some common words in these tongues.

شعبہ جاتی مجلّہ ''تحقیق'' کے دستیاب شمارے

شمارہ	طباعت	صفحات	قیمت
دوسرا	1998ء	390	80/-
تیسرا	1989ء	510	80/-
پانچواں	1991ء	474	80/-
ششم	1992ء	448	80/-
ہفتم	1993ء	488	80/-
ہشتم، نہم (مشترکہ)	1994-95ء	594	80/-
دسواں، گیارواں (مشترکہ)	1996-97ء	1046	200/-
بارہواں، تیرہواں (مشترکہ)	1998-99ء	1011	200/-

فروخت کی شرائط:

1۔ رسالے کی خریداری پر 30% فی صد رعایت دی جائے گی اور ڈاک خرچ شعبے کے ذمہ ہوگا۔

2۔ رسالہ V.P.P ارسال نہیں کیا جائے گا۔ رقم کا پیشگی (منی آرڈر/ پوسٹل آرڈر/ بینک ڈرافٹ کے ذریعے) آنا ضروری ہے۔

3۔ کسی بھی بک سیلر کو فروخت کے لیے رسالہ ادھار نہیں دیا جائے گا۔

مدیر

TAHQIQ

(14)

2006

Printed at:
Sindh University Press, Hyderabad. Phone: 9200696